منٹو پچیسی
اے۔ رحمان

منٹو پچیسی

منٹو پچیسی

انتخاب ترتیب و تجزیہ

اے۔ رحمان

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

نام کتاب : منٹو پچیسی

انتخاب وتجزیہ : اے۔رحمان

مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

سرورق : (منٹو اور فرائڈ) آئیڈیا و ڈزائن — اے رحمان

زیر اہتمام : عالمی اردو ٹرسٹ، نئی دہلی

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹرو پول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Manto Pachchisi

Compiled by:

A. Rehman

ISBN: 978-93-80934-61-[illegible]-

Edition :2012

Price: **Rs. 250/-**

Library Edition: Rs. 325/-

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

 # 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 9810784549, 9873156910
E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

اللہ کے نام

جس نے منٹو جیسا شاہ کار تخلیق کیا!!!

فہرست

پیش لفظ

۱۔	اجی ڈوڈو	1
۲۔	اُوپر نیچے اور درمیان	8
۳۔	بابو گوپی ناتھ	18
۴۔	برمی لڑکی	32
۵۔	بُو	42
۶۔	پھاہا	49
۷۔	پھندنے	55
۸۔	ٹھنڈا گوشت	63
۹۔	جانکی	70
۱۰۔	خوشیا	89
۱۱۔	دُھواں	97
۱۲۔	ڈارلنگ	105
۱۳۔	ڈاکٹر شروڈکر	113
۱۴۔	راجو	118
۱۵۔	سرکنڈوں کے پیچھے	124

۱۶۔	سو کینڈل پاور کا بلب	136
۱۷۔	شادی	145
۱۸۔	شاردا	157
۱۹۔	شُوشُو	176
۲۰۔	عزّت کے لیے	185
۲۱۔	عورت ذات	192
۲۲۔	کالی شلوار	199
۲۳۔	ممّی	213
۲۴۔	موذیل	250
۲۵۔	ہتک	271

پیش لفظ

منٹو کو میں اردو کا Most misunderstood افسانہ نگار سمجھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا یقین واثق ہے کہ منٹو پہلا افسانہ نگار ہے جس نے اپنے افسانوں میں مکمل انسان پیش کیا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ منٹو کے قاری ہمیشہ دو طبقوں میں بٹے رہے۔ ایک طبقہ تو وہ جو ہر چیز کو اخلاق اور کبھی کبھی براہِ راست مذہب کی عینک سے دیکھتا ہے لہٰذا اس طبقے کے قارئین، مبصرین اور ناقدین نے اس کے افسانوں پر فحاشی مضرت رسانی اور تضیع اوقات کے لیبل چسپاں کر دیئے اور بری الذمہ ہو گئے۔ دوسرا طبقہ منٹو کے حق میں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے (اور ہیں) جو آزاد خیال بھی ہیں اور ادب کو اخلاق و مذہب کی قید سے آزاد رکھنے کے حامی بھی، لیکن جو اپنی علمی کم مائیگی کے باعث منٹو کے افسانوں کی اس تناظر میں تشریح نہ کر سکے جس تناظر میں اسے ہونا چاہئے تھا۔ یہاں میں خصوصی طور پر ان افسانوں کی بات کر رہا ہوں جنھیں جنسی یا جنسیاتی افسانے کہا جاتا ہے اور جو منٹو کی فنی عظمت کے علم بردار ہیں۔

جنسیات ایک منظم اور منضبط سائنس ہے۔ لیکن اس کے دو مختلف پہلو ہیں۔ ایک جسمانی اور دوسرا نفسیاتی۔ علم الابدان کا کوئی بھی طالب علم ان تمام اعضائے جسمانی کی اندرونی اور بیرونی تعریف و تشریح کر سکتا ہے جو جنسی اختلاط میں بروئے کار آتے ہیں۔ لیکن ذہنِ انسانی کی وہ Impulses اور ان سے پیدا شدہ احکامات جو ان اعضاء کو تحریک دیتے ہیں اور پھر جنسی عمل سے پیدا شدہ لذت اور/یا دوسرے محسوسات کا جس طور انجذاب ہوتا ہے نیز یہ Process کن عوامل کے تابع ہے یہ سب سمجھنے کے لئے جنسیات اور جنس کی نفسیات کا خاطر خواہ علم درکار ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جنس کی نفسیات کا علم ایک بحرِ ذخار ہے اور اس کا کسب وحمل عام نہیں۔

برطانوی ماہر نفسیات ہیولاک ایلس Havelock Ellis (1859-1939) نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف Studies in the Psychology of Sex (جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے) میں انسانی جنسیات کا اُس کے نفسیاتی تناظر میں ہر زاویئے سے سیر حاصل تجزیہ کر کے ذہن انسانی کے عمیق ترین گوشوں میں پوشیدہ ان تمام تقاضوں، ضرورتوں اور خواہشات کو بعد تلاش بسیار آشکار کیا ہے جو ہر طرح کے جسمانی عمل کو تحریک دیتی ہیں اور مختلف النوع جسمانی رویئے جن کا فطری

اظہار سمجھے جانے چاہئیں۔

ہیولاک ایلس پہلا ماہر نفسیات تھا جس نے ہم جنس پرستی کا سائنٹفک مطالعہ کیا۔ اُس کی تصنیف جنسی معکوسیت Sexual Inversion پہلی ایسی کتاب ہے جس میں ہم جنس پرستی کو جنسی کمزوری یا بیماری کے طور پر نہیں بلکہ سائنسی اصولوں کے زاویئے سے معروضی طور پر دیکھا گیا اور اصولِ لذت Pleasure Principle پر مبنی نتائج اخذ کیے گئے۔ ایلس کو جنسیاتی اصطلاح Homosexuality (ہم جنس پرستی) کا موجد مانا جاتا ہے حالانکہ 1897 میں اس نے لکھا تھا ''ہم جنس پرستی Homosexuality ایک وحشیانہ طور پر دوغلی اصطلاح ہے اور میں اس کے لیے ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں'' یہ قابلِ ذکر ہے کہ انیسویں صدی کے انگلینڈ میں جنسی معاملات کے اظہار کے تئیں عوام کا اخلاقی نقطۂ نظر سے وہی رویہ تھا جو منٹو کے افسانوں کے تئیں اردو داں طبقہ کا بیسویں صدی کے نصف تک رہا۔

فرائڈ اور ہیولاک ایلس ہم عصر تھے لیکن فرائڈ نے ''ماورائے اصول لذت'' Beyond Pleasure Principle نظریہ پیش کیا جس کی رو سے انسانی اعمال وافعال کا فطری جواز ملتا ہے اور Death wish کی تشریح ہوتی ہے۔

زیرِ نظر انتخاب میں منٹو کے وہ افسانے شامل ہیں جن کو میں جنسی نفسیات کے افسانے سمجھتا ہوں اور جن میں انسانی کردار اپنی مکمل ہیئت میں نظر آتے ہیں۔ وہ تمام حیوانی جبلّتیں اور خصائل جو فطرت انسان کے اجزائے ترکیبی ہیں کھل کھیلتے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان تمام افسانوں کے پلاٹ ایسے نفسیاتی عوامل پر مبنی ہیں جن کی قوت تحریک ہر مخصوص کردار کے رویّوں کا سائنٹیفک جواز ہے۔ جنسی نفسیات کی رو سے کوئی عمل اچھا یا برا نہیں ہوتا اگر وہ کسی فطری تقاضے، جبلّت یا خصلت کا بے محابا اظہار ہے۔ جنسی رشتوں اور اختلاط پر اچھے برے کا لیبل معاشرتی اقدار اور اخلاقی رویّوں کا غماز ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔

ہیولاک ایلس کی کتاب جنسی نفسیات کی انجیل ہے اور اس میں درج بنیادی سائنٹفک اصولوں کو سمجھے بغیر منٹو کی ایماندارانہ تشریح ممکن نہیں۔

دہلی، مئی ۲۰۱۲ء

اے رحمان

انجی ڈڈر

''مجھے مت ستایئے .... خدا کی قسم، میں آپ سے کہتی ہوں مجھے مت ستایئے۔''

''تم بہت ظلم کر رہی ہو آج کل!''

''جی ہاں، بہت ظلم کر رہی ہوں۔''

''یہ تو جواب نہیں۔''

''میری طرف سے صاف جواب ہے اور یہ میں آپ سے کئی دفعہ کہہ چکی ہوں۔''

''آج میں کچھ نہیں سنوں گا۔''

''مجھے مت ستایئے، خدا کی قسم، میں آپ سے سچ کہتی ہوں، مجھے مت ستایئے۔ میں چلّانا شروع کر دوں گی۔''

''آہستہ بولو۔ بچیاں جاگ پڑیں گی۔''

''آپ تو بچیوں کے ڈھیر لگانا چاہتے ہیں۔''

''تم ہمیشہ مجھے یہ طعنہ دیتی ہو۔''

''آپ کو کچھ خیال تو ہونا چاہیے .... میں تنگ آ چکی ہوں۔''

''درست ہے .... لیکن ....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں!''

''تمہیں میرا خیال کچھ نہیں .... اصل میں اب تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں ....
آج سے آٹھ برس پہلے جو بات تھی وہ اب نہیں رہی .... تمہیں اب میری ذات سے کوئی

دلچسپی ہی نہیں رہی۔"

"جی ہاں۔"

"وہ کیا دن تھے جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ تمہیں میری ہر بات کا کتنا خیال رہتا تھا۔ ہم باہم کس قدر شیر و شکر تھے.......... مگر اب تم کبھی سونے کا بہانہ کر دیتی ہو۔ کبھی تھکاوٹ کا عذر پیش کر دیتی ہو اور کبھی دونوں کان بند کر لیتی ہو، کبھی سنتی ہی نہیں۔"

"میں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں!"

"تم ظلم کی آخری حد تک پہنچ گئی ہو۔"

"مجھے سونے دیجئے۔"

"سو جائیے...... مگر میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہوں گا...... آپ کی بلا سے......!"

"آہستہ بولئے.......... ساتھ ہمسائے بھی ہیں۔"

"ہوا کریں۔"

"آپ کو تو کچھ خیال ہی نہیں.......... سنیں گے تو کیا کہیں گے۔"

"کہیں گے کہ اس غریب آدمی کو کیسی کڑی بیوی ملی ہے۔"

"اوہ ہو۔"

"آہستہ بولو.......... دیکھو بچی جاگ پڑی!"

"اللہ اللہ.......... اللہ جی اللہ.......... اللہ اللہ.......... اللہ جی.......... سو جاؤ بیٹے سو جاؤ.......... اللہ اللہ، اللہ جی اللہ.......... خدا کی قسم آپ بہت تنگ کرتے ہیں۔ دن بھر کی تھکی ماندی کو سونے تو دیجئے!"

اللہ اللہ.......... اللہ جی.......... اللہ اللہ.......... اللہ جی اللہ.......... تمہیں اچھی طرح سلانا بھی نہیں آتا۔"

"آپ کو تو آتا ہے نا.......... سارا دن آپ گھر میں رہ کر یہی تو کرتے رہتے ہیں۔"

"بھئی میں سارا دن گھر میں کیسے رہ سکتا ہوں.......... جب فرصت ملتی ہے آ جاتا ہوں اور تمہارا ہاتھ بٹا دیتا ہوں۔"

"میرا ہاتھ بٹانے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں۔ آپ مہربانی کر کے گھر سے باہر اپنے دوستوں ہی کے ساتھ گل چھرّے اڑایا کریں۔"

"گل چھرّے؟"

''میں زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی''

''اچھا دیکھو، میری ایک بات کا جواب دو۔''

''خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کیجئے۔''

''کمال ہے میں کہاں جاؤں۔''

''جہاں آپ کے سینگ سمائیں چلے جایئے۔''

''لو اب ہمارے سینگ بھی ہو گئے۔''

''آپ چپ نہیں رہیں گے۔''

''نہیں.......... میں آج بولتا ہی رہوں گا۔ خود سوؤں گا نہ تمہیں سونے دوں گا۔''

''سچ کہتی ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گی.......... لوگو یہ کیسا آدمی ہے.......... کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے.......... بس ہر وقت۔ ہر وقت ہر وقت..........''

''تم ضرور تمام بچیوں کو جگا کر رہو گی۔''

''نہ پیدا کی ہوتیں اتنی!''

پیدا کرنے والا میں تو نہیں ہوں.......... یہ تو اللہ کی دین ہے.......... اللہ اللہ.......... اللہ جی، اللہ.......... اللہ جی اللہ۔''

''بچی کو اب میں نے جگایا تھا؟''

''مجھے افسوس ہے!''

''افسوس ہے کہہ دیا.......... چلو چھٹی ہوئی.......... گلا پھاڑ پھاڑ کر چلائے جا رہے ہیں۔ ہمسائیگی کا کچھ خیال نہیں۔ کیا کہیں گے اس کی کوئی پرواہی نہیں۔ خدا کی قسم میں عنقریب ہی دیوانی ہو جاؤں گی۔''

''دیوانے ہوں تمہارے دشمن''

''میری جان کے دشمن تو آپ ہیں۔''

''تو خدا مجھے دیوانہ کرے۔''

''وہ تو آپ ہیں!''

''میں دیوانہ ہوں، مگر تمہارا''

''اب چونچلے نہ بگھاریئے۔''

''تم تو نہ یوں مانتی ہو نہ ووں''

"میں سونا چاہتی ہوں۔"

"سو جاؤ، میں پڑا بکواس کرتا رہوں گا۔"

"یہ بکواس کیا اشد ضروری ہے۔"

"ہے تو سہی .... ذرا ادھر دیکھو ...."

"میں کہتی ہوں مجھے تنگ نہ کیجئے۔ میں رووں گی۔"

"تمہارے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ میری ساری زندگی تمہارے لئے ہے، سمجھ میں نہیں آتا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو تو بتا دو۔"

"آپ کی تین خطائیں یہ سامنے پلنگ پر پڑی ہیں۔"

"یہ تمہارے کوسنے ختم نہیں ہوں گے۔"

"آپ کی ہٹ کب ختم ہو گی؟"

"لو بابا میں تم سے کچھ نہیں کہتا، سو جاؤ .... میں نیچے چلا جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"جہنم میں"

"یہ کیا پاگل پن ہے .... نیچے اتنے مچھر ہیں .... پنکھا بھی نہیں .... سچ کہتی ہوں، آپ بالکل پاگل ہیں .... میں نہیں جانے دوں گی آپ کو"

میں یہاں کیا کروں گا .... مچھر ہیں پنکھا نہیں ہے .... ٹھیک ہے میں نے زندگی کے بڑے دن بھی گزارے ہیں۔ تن آسان نہیں ہوں .... سو جاؤں گا صوفے پر۔"

"سارا وقت جاگتے رہیں گے۔"

"تمہاری بلا سے"

"میں نہیں جانے دوں گی، آپ کو .... بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں"

"میں مر نہیں جاؤں گا .... مجھے جانے دو۔"

"کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں! .... خبردار جو آپ گئے!"

"مجھے یہاں نیند نہیں آئے گی۔"

"نہ آئے۔"

"یہ عجب منطق ہے .... میں کوئی لڑ جھگڑ کر تو نہیں جا رہا۔"

"لڑائی جھگڑا کیا ابھی باقی ہے .... خدا کی قسم آپ کبھی کبھی بالکل بچوں کی سی

باتیں کرتے ہیں.......... اب یہ خبط سر میں سمایا ہے کہ میں نیچے گرمی اور مچھروں میں جا کر سوؤں گا.......... کوئی اور ہوتی تو پاگل ہو جاتی۔"

"تمہیں میرا بڑا خیال ہے۔"

"اچھا بابا نہیں ہے.......... آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"اب سیدھے راستے پر آئی ہو۔"

"چلئے ہٹئے.......... میں کوئی راستہ نہیں جانتی، منہ دھو کے رکھئے اپنا۔"

"منہ صبح دھویا جاتا ہے۔ لو اب سن جاؤ۔"

"توبہ!"

"ساڑی پر وہ باڈر لگ کر آ گیا؟"

"نہیں!"

"عجب الو کا پٹھا ہے درزی.......... کہہ رہا تھا آج ضرور پہنچا دے گا۔"

"لے کر آیا تھا، مگر میں نے واپس کر دی.........."

"کیوں؟"

ایک دو جگہ جھول تھے۔"

"اوہ.......... اچھا، میں نے کہا کل برسات دیکھنے چلیں گے۔ میں نے پاس کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کتنے آدمیوں کا؟"

"دو کا"

"کیوں؟"

"باجی بھی جانا چاہتی تھیں۔"

"ہٹاؤ باجی کو، پہلے ہم دیکھیں گے پھر ان کو دکھا دیں گے.......... پہلے ہفتے میں پاس بڑی مشکل سے ملتے ہیں.......... چاندنی رات میں تمہارا بدن کتنا چمک رہا ہے۔"

"مجھے تو اس چاندنی سے نفرت ہے کم بخت آنکھوں میں گھستی ہے۔ سونے نہیں دیتی۔"

"تمہیں تو بس ہر وقت سونے کی پڑی رہتی ہے۔"

"آپ کو بچیوں کی دیکھ بھال کرنا پڑے تو پھر پتا چلے۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ ایک کے کپڑے بدلو، تو دوسرے کے میلے ہو جاتے ہیں، ایک کو سلاؤ، دوسری جاگ پڑتی ہے،

تیسری نعمت خانے کی عمارت گری میں مصروف ہوتی ہے۔"

"دونوکر گھر میں موجود ہیں۔"

"نوکر کچھ نہیں کرتے۔"

"تو انہیں نکال باہر کرو۔"

"آہستہ بولئے..........دیکھئے چھوٹی کیسے چونکی ہے۔"

"معاف کردینا..........ذرا ہاتھ سے تھپکا دو!"

"منجھلی بھی تڑپ رہی ہے۔"

"پیشاب کرادیا تھا اسے۔"

"جی ہاں!"

"پھر کیا وجہ ہے؟"

"گرمی آج کچھ زیادہ ہے..........آپ پرے ہٹ جایئے۔"

"نہیں نہیں"

"آخر ہار مجھے ہی ماننی پڑتی ہے۔"

"تمہاری ہار ہار نہیں جیت ہوتی ہے..........اللہ بہتر جانتا ہے، مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟"

"اپنی محبت آپ اسی وقت جتایا کرتے ہیں۔"

"لو بھئی اور کیا سر بازار تم سے محبت کیا کروں..........ادھر دیکھو میری طرف۔"

"آپ اپنی کر کے رہیں گے"

"میری جان جو ہوئیں تم۔"

"میں نے کہا ہٹئے۔"

"کیا ہوا؟"

"دیکھتے نہیں بڑی اٹھ کر بیٹھی ہوئی ہے۔"

"اوہ!"

"سُنا نہیں آپ نے؟"

"کیا؟"

"کہہ رہی ہے ابجی ڈڈو!"

''ہاں ہاں سنا ہے.........دے لے دودھ۔''

''میں نیچے بھول آئی ہوں۔''

''نیچے؟''

''ہاں نعمت خانے میں.........جائیے لے آئیے۔''

''لے آؤں نیچے سے؟''

''جلدی جائیے ورنہ رونا شروع کر دے گی''

''جاتا ہوں!''

میں نے کہا! سنئے.........آگ جلا کر ذرا کنکنا کر لیجئے گا دودھ۔''

''اچھا.........سن لیا ہے!''

(۱۳؍جون ۱۹۵۰ء)

اُوپر نیچے اور دَرمیان

یہ افسانہ میرے ناشر نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اس سلسلے میں ہم بہت اوپر نیچے ہوئے۔

قصہ یہ تھا کہ اس افسانے پر مجھ پر کراچی میں مقدمہ چلا تھا۔ سزا کے طور پر مجھے پچیس روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ اپنے ناشر سے مزید پچیس روپے لے لوں، تاکہ مجھے کسی قدر تسکین ہو جائے۔ مگر وہ نہ مانے۔

آخر مَیں نے اِدھر اُدھر سے اوپر، نیچے، درمیان ہو کر کچھ روپے پیدا کیے اور یہ افسانہ چھپوایا، تاکہ آپ تک پہونچ جائے۔ آپ اس کو یقیناً شرفِ قبولیت بخشیں گے، اس لئے کہ آپ ناشر نہیں، میرے قاری ہیں۔

رَاقِمْ
سعادت حسن منٹو

O

میاں صاحب

بہت دیر کے بعد آج مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

بیگم صاحبہ

جی ہاں!

میاں صاحب

معروفیتیں...... بہت پیچھے ہٹتا ہوں مگر نا اہل لوگوں کا خیال کر کے قوم کی پیش کی ہوئی ذمہ داریاں سنبھالنی ہی پڑتی ہیں۔

بیگم صاحبہ

اصل میں آپ ایسے معاملوں میں بہت نرم دل واقع ہوئے ہیں، بالکل میری طرح۔

میاں صاحب

ہاں! مجھے آپ کی سوشل ایکٹی ویٹز کا علم ہوتا رہتا ہے۔ فرصت ملے تو کبھی اپنی وہ تقریریں بجھوا دیجئے گا جو پچھلے دنوں آپ نے مختلف موقعوں پر کی ہیں...... میں فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔

بیگم صاحبہ

بہت بہتر۔

میاں صاحب

ہاں بیگم! وہ میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کیا تھا!

بیگم صاحبہ

کس بات کا؟

میاں صاحب

میرا خیال ہے، ذکر نہیں کیا...... کل اتفاق سے میں منجھلے صاحبزادے کے کمرے میں جا نکلا، وہ لیڈی چیٹرلیز لور پڑھ رہا تھا۔

بیگم صاحبہ

وہ رسوائے زمانہ کتاب!

میاں صاحب

ہاں بیگم۔

بیگم صاحبہ

آپ نے کیا کیا؟

میاں صاحب

میں نے اس سے کتاب چھین کر غائب کر دی۔

بیگم صاحبہ

بہت اچھا کیا آپ نے۔

میاں صاحب

اب میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے مشورہ کروں اور اسکی روزانہ غذا میں تبدیلی کرادوں۔

بیگم صاحبہ

بڑا صحیح قدم اُٹھائیں گے آپ۔

میاں صاحب

مزاج کیسا ہے آپ کا؟

بیگم صاحبہ

ٹھیک ہے۔

میاں صاحب

میرا خیال تھا کہ آج آپ سے...... درخواست کروں۔

بیگم صاحبہ

اوہ! آپ بہت بگڑتے جارہے ہیں۔

میاں صاحب

یہ سب آپ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

بیگم صاحبہ

لیکن آپ کی صحت؟

میاں صاحب

صحت؟ اچھی ہے لیکن ڈاکٹر سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھاؤں گا......اور آپ کی طرف سے بھی مجھے پورا اطمینان ہونا چاہئے۔

بیگم صاحبہ

میں آج ہی مس سلڈ ھانا سے پوچھ لوں گی۔

میاں صاحب

اور میں ڈاکٹر جلال سے۔

بیگم صاحبہ

قاعدے کے مطابق ایسا ہی ہونا چاہیے۔

میاں صاحب

اگر ڈاکٹر جلال نے اجازت دے دی؟

بیگم صاحبہ

اگر مس سلڈھانا نے اجازت دے دی...... مفلر اچھی طرح لپیٹ لیجئے۔ باہر سردی ہے۔

میاں صاحب

شکریہ!

○

ڈاکٹر جلال

تم نے اجازت دے دی؟

مس سلڈھانا

جی ہاں!

ڈاکٹر جلال

میں نے بھی اجازت دے دی...... حالانکہ شرارت کے طور پر......

مس سلڈھانا

حالانکہ شرارت کے طور پر میں بھی چاہتی تھی کہ اجازت نہ دوں۔

ڈاکٹر جلال

لیکن مجھے ترس آگیا۔

مس سلڈھانا

مجھے بھی۔

ڈاکٹر جلال

پورے ایک برس کے بعد وہ............

مس سلڈھانا

ہاں پورے ایک برس کے بعد۔

ڈاکٹر جلال

میری انگلیوں کے نیچے اس کی نبض تیز ہوگئی، جب میں نے اس کو اجازت دی۔

مس سلڈھانا

اس کی بھی یہی کیفیت تھی۔

ڈاکٹر جلال

اس نے مجھ سے ڈرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر! ایسا معلوم ہوتا ہے، میرا دل کمزور ہوگیا ہے.... آپ کارڈیوگرام لیجیے:

مس سلڈھانا

اس نے بھی مجھ سے یہی کہا۔

ڈاکٹر جلال

میں نے اس کے ٹیکہ لگا دیا۔

مس سلڈھانا

مَیں نے بھی...... صرف سادہ پانی کا۔

ڈاکٹر جلال

سادہ پانی بہترین چیز ہے۔

مِس سلڈھانا

جلال! اگر تم اس بیگم کے شوہر ہوتے؟

ڈاکٹر جلال

اگر تم اس میاں کی بیوی ہوتیں؟

مِس سلڈھانا

میرا کیریکٹر خراب ہو گیا ہوتا!

ڈاکٹر جلال

میرا جنازہ اُٹھ گیا ہوتا!

مِس سلڈھانا

یہ بھی تمہارے کیریکٹر کی خرابی کہلاتی۔

ڈاکٹر جلال

ہم جب بھی سوسائٹی کے ان الوؤں کو دیکھنے آتے ہیں، ہمارا کیریکٹر خراب ہو جاتا ہے۔

مِس سلڈھانا

آج بھی ہوگا؟

ڈاکٹر جلال

بہت زیادہ۔

مِس سلڈھانا

مگر مصیبت یہ ہے کہ ان کا لمبے لمبے وقفوں کے بعد ہوتا ہے۔

☆☆

O

بیگم صاحبہ

لیڈی چیٹرلیز لور، یہ آپ نے تکیے کے نیچے کیوں رکھی ہوئی ہے؟

میاں صاحب

میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کتاب کتنی بے ہودہ اور واہیات ہے۔

بیگم صاحبہ

میں بھی آپ کے ساتھ دیکھوں گی۔

میاں صاحب

میں جستہ جستہ دیکھوں گا۔ پڑھتا جاؤں گا۔ آپ بھی سُنتی جایئے۔

بیگم صاحبہ

یہ بہت اچھا رہے گا۔

میاں صاحب

میں نے منجھلے صاحبزادے کی روزانہ غذا میں ڈاکٹر کے مشورے سے تبدیلیاں کرادی ہیں۔

بیگم صاحبہ

مجھے یقین تھا کہ آپ نے اس معاملے میں غفلت نہیں برتی ہوگی۔

میاں صاحب

میں نے اپنی زندگی میں کبھی آج کا کام کل پر نہیں چھوڑا۔

بیگم صاحبہ

میں جانتی ہوں......اور خاص کر آج کا کام تو آپ کبھی......

میاں صاحب

آپ کا مزاج کتنا شگفتہ ہے......

بیگم صاحبہ

یہ سب آپ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

میاں صاحب

میں بہت محظوظ ہوا ہوں......اگر آپ کی اجازت ہو تو......

بیگم صاحبہ

ٹھہریئے! کیا آپ نے دانت صاف کیے؟

میاں صاحب

جی ہاں! میں دانت صاف کر کے اور ڈیٹول کے غرارے کر کے آیا تھا۔

بیگم صاحبہ

میں بھی۔

میاں صاحب

اصل میں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے تھے۔

بیگم صاحبہ

اس میں کیا شک ہے۔

میاں صاحب

میں جستہ جستہ یہ بے ہودہ کتاب پڑھنا شروع کروں۔

بیگم صاحبہ

ٹھہریئے! ذرا میری نبض دیکھیے۔

میاں صاحب

کچھ تیز چل رہی ہے......میری دیکھیے۔

بیگم صاحبہ

آپ کی بھی تیز چل رہی ہے۔

میاں صاحب

وجہ؟

بیگم صاحبہ

دل کی کمزوری!

میاں صاحب

یہی وجہ ہو سکتی ہے...... لیکن ڈاکٹر جلال نے کہا تھا، کوئی خاص بات نہیں۔

بیگم صاحبہ

مس سلڈھانا نے بھی یہی کہا تھا۔

میاں صاحب

اچھی طرح امتحان کر کے اس نے اجازت دی تھی؟

بیگم صاحبہ

بہت اچھی طرح امتحان کر کے اجازت دی تھی۔

میاں صاحب

تو میرا خیال ہے، کوئی حرج نہیں۔

بیگم صاحبہ

آپ بہتر سمجھتے ہیں...... ایسا نہ ہو، آپ کی صحت......

میاں صاحب

اور آپ کی صحت بھی......

بیگم صاحبہ

اچھی طرح سوچ سمجھ کر ہی قدم اُٹھانا چاہیے۔

میاں صاحب

مس سلڈھانا نے اس کا تو بندوبست کر دیا ہے نا؟

بیگم صاحبہ

کس کا......؟ ہاں، ہاں، اس کا تو بندوبست کر دیا ہے اس نے۔

میاں صاحب

یعنی اس طرف سے تو پورا اطمینان ہے۔

بیگم صاحبہ

جی ہاں!

میاں صاحب

ذرا اب دیکھیے نبض؟

بیگم صاحبہ

اب تو...... ٹھیک چل رہی ہے...... میری؟

میاں صاحب

آپ کی بھی نورمل ہے۔

بیگم صاحبہ

اس بے ہودہ کتاب کا کوئی پیرا تو پڑھیے۔

میاں صاحب

بہتر...... نبض پھر تیز ہو گئی۔

بیگم صاحبہ

میری بھی۔

میاں صاحب

نوکروں سے مطلوبہ سامان رکھوا دیا آپ نے کمرے میں؟

بیگم صاحبہ

جی ہاں! سب چیزیں موجود ہیں۔

میاں صاحب

اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میرا ٹمپریچر لے لیجیے۔

بیگم صاحبہ

کیا آپ تکلیف نہیں کر سکتے...... اسٹاپ واچ موجود ہے۔ نبض کی رفتار بھی دیکھ لیجیے۔

میاں صاحب

ہاں! یہ بھی نوٹ ہونی چاہیے۔

بیگم صاحبہ

سملنگ سالٹ کہاں ہے؟

میاں صاحب

دوسری چیزوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

بیگم صاحبہ

جی ہاں! پڑا ہے تپائی پر۔

میاں صاحب

کمرے کا ٹمپریچر، میرا خیال ہے، تھوڑا سا بڑھا دینا چاہیے۔

بیگم صاحبہ

میرا بھی یہی خیال ہے۔

میاں صاحب

نقاہت زیادہ ہو گئی تو مجھے دوا دینا نہ بھولیے گا!

بیگم صاحبہ

میں کوشش کروں گی اگر......

میاں صاحب

ہاں ہاں......! بصورت دیگر آپ تکلیف نہ اُٹھایئے گا۔

بیگم صاحبہ

آپ یہ صفحہ...... یہ پورا صفحہ پڑھیے......

میاں صاحب

سُنیے......!

بیگم صاحبہ

یہ آپ کو چھینک کیوں آئی؟

میاں صاحب

معلوم نہیں۔

بیگم صاحبہ

حیرت ہے۔

میاں صاحب

مجھے خود حیرت ہے۔

بیگم صاحبہ

اوہ...... میں نے کمرے کا ٹمپریچر بڑھانے کے بجائے گھٹا دیا تھا...... معافی چاہتی ہوں

میاں صاحب

یہ اچھا ہوا کہ چھینک آگئی اور بروقت پتہ چل گیا۔

بیگم صاحبہ

مجھے بہت افسوس ہے۔

میاں صاحب

کوئی بات نہیں۔ بارہ قطرے برانڈی اس کی تلافی کردیں گے۔

بیگم صاحبہ

ٹھہریئے......! مجھے ڈالنے دیں۔ آپ سے گننے میں غلطی ہو جایا کرتی ہے۔

میاں صاحب

یہ تو درست ہے۔ آپ ڈال دیجیے۔

بیگم صاحبہ

آہستہ آہستہ پیجیے۔

میاں صاحب

اس سے زیادہ آہستہ اور کیا ہو گا؟

بیگم صاحبہ

طبیعت بحال ہوئی؟

میاں صاحب

ہو رہی ہے۔

بیگم صاحبہ

آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔

میاں صاحب

ہاں...... میں خود اسکی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔

☆☆

O

نوکر

کیا بات ہے، آج بیگم صاحبہ نظر نہیں آ ئیں؟

نوکرانی

طبیعت ناساز ہے ان کی۔

نوکر

میاں صاحب کی طبیعت بھی ناساز ہے۔

نوکرانی

ہمیں معلوم ہی تھا۔

نوکر

ہاں! لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

نوکرانی

کیا؟

نوکر

یہ قدرت کا تماشا...... ہمیں تو آج بسترِ مرگ پر ہونا چاہیے تھا۔

نوکرانی

کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو۔ بسترِ مرگ پر ہوں وہ......

نوکر

نہ چھیڑو ان کے بسترِ مرگ کا ذکر...... بڑا شاندار ہوگا......
خواہ مخواہ میرا جی چاہے گا کہ اٹھا کر اپنی کوٹھری میں لے جاؤں۔

نوکرانی

کہاں چلے؟

نوکر

بڑھئی ڈھونڈنے جا رہا ہوں...... چارپائی اب بالکل جواب دے چکی ہے۔

نوکرانی

ہاں! اس سے کہنا، مضبوط لکڑی لگائے۔

☆☆

بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی ان دنوں میں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈ لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا: ''منٹو صاحب! بابو گوپی ناتھ سے ملئے۔''

میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ ''بابو گوپی ناتھ تم ہندوستان کے نمبرون رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو۔'' لکھتا ہے تو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلا لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب؟ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کار ساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ، ہے اینٹی کی پینٹی پو؟''

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی، دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اس کی اپنی اختراع تھے جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا جو بہت مرعوب نظر آتا تھا: ''آپ ہیں بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبئی تشریف لائے ہیں ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔''

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو ناکافی سمجھ کر کہا: ''نمبرون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ

آپ ہیں۔لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کرکے، ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں۔بس منٹو صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لایئے۔''

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا، چونک کر کہا: ''ہاں ہاں، ضرور تشریف لایئے منٹو صاحب۔'' پھر سینڈو سے پوچھا: ''کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں؟''

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا: ''اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آیئے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے، اس لئے کہ مفت ملتی ہے۔''

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتا لکھا دیا جہاں میں حسب وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں، تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔سینڈو نے اس کے بارے میں کہا: ''آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جایئے آپ۔جس آدمی کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو، پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے، یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بے وقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور اسکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو........''

غفار سائیں یہ سن کر مسکراتا رہا۔

دوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔لمبا تڑنگا جوان، کسرتی بدن، منہ پر چیچک کے داغ۔اس کے متعلق سینڈو نے کہا: ''یہ میرا شاگرد ہے۔اپنے استاد کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہوگئی۔بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لئے، مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی، میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ایک تکیے میں بات چیت پیتے کرتے بابو گوپی ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔''

یہ سن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سرخ و سفید عورت تھی۔کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ

گیا تھا کہ وہی کشمیر کی کتوبری ہے۔ جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا۔ بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الہڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا: ''زینت بیگم۔ بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی خرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اڑے۔ مقدمے بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولیس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا اور اسے یہاں لے آئے .... دھڑن تختہ!''

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اور سینڈو نے کہا: ''اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔''

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا: ''جناب یہ ہے ٹین پوٹی، فل فوٹی۔ مسز عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم .... آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلوا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر روز شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فورٹیٹ قسم کی عورت ہے۔''

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا: ''بکواس نہ کر!'' اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا ''چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔''

سینڈو چلایا: ''بوائے۔ وسکی اینڈ سوڈا .... بابو گوپی ناتھ لگاؤ ہوا ایک سبزے کو۔''

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلنڈا نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا: ''او گوڈ ــــ او میرے رب العالمین ــــ وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر یوں نوٹ نکالا کروں گا ــــ جاؤ بھئی غلام علی دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔''

بوتلیں آئیں۔ سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران

میں سب سے زیادہ باتیں حسب معمول عبدالرحیم نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی بار میں ختم کر کے وہ چلایا: ''دھڑن تختہ منٹو صاحب، وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اتر کر پیٹ میں ''انقلاب، زندہ باد'' لکھتی چلی گئی ہے — جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔''

بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو بھی کہے، مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس سے دراصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یوں بھی مجھے دوران گفتگو میں معلوم ہوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا، جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے چنانچہ اس سے ایک بار کہا: ''بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

وہ چونک پڑا: ''جی میں — میں — کچھ نہیں'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی: ''ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہوں — اور ہمیں کیا سوچ ہو گی!''

سینڈو نے کہا ''بڑے خانہ خراب ہیں یہ، منٹو صاحب۔ بڑے خانہ خراب ہیں — لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹلی نہ رہ چکی ہو۔''

بابو گوپی ناتھ نے یہ سن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا: ''اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب''

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی، کون نٹنی تھی، کون کس کی نوچی تھی، نتھنی اتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی، ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں۔ مطلب تو میں سمجھتا رہا مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اسے اس گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وسکی کا ایک گلاس بھی نہیں پیا۔ بغیر کسی دلچسپی کے سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا اسے تمباکو اور اس کے دھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اسے محبت تھی، اس کا پتا مجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا کیونکہ زینت کی آسائش کے لئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مجھے محسوس ہوئی کہ ان دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ

تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اسے سورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پگ پینے کے بعد اپنی تسبیح اٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا، زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا: ''منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا: ''بڑا نیک خیال ہے۔''

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا۔ ''منٹو صاحب! ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم نہ زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا جان من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا، معلوم ہے آپ کو؟ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے — منٹو صاحب موٹر کتنے میں آ جائے گی۔''

میں نے کہا ''مجھے معلوم نہیں۔''

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا: ''کیا بات کرتے ہیں آپ منٹو صاحب — آپ کو، اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلئے میرے ساتھ، زینو کے لئے ایک موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئی میں موٹر ہونی ہی چاہئے۔'' زینت کا چہرہ ردعمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں — لیکن آپ مجھے بتائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اس سے کہا مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا — بہت گنہ گار آدمی ہوں — وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور؟''

میں نے کہا ''نہیں نہیں — بہت پی چکے ہیں۔''

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا: ''اور پیجئے منٹو صاحب!'' یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلنڈا نکالا اور ایک نوٹ جدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے: ''سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہوا؟''

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اس غریب کے

ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا: ''منٹو صاحب! اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام کی جیب سے گر پڑے گا یا۔۔۔''

بابو گوپی ناتھ نے پورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرام زادے نے اس کی جیب سے سارے روپے نکال لئے۔بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر غلام علی کو دے کر کہا: ''جلدی کھانا لے آؤ۔''

پانچ چھ ملاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہوا۔پوری طرح تو خیر انسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے، غلط ثابت ہوا۔اس کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ سینڈو، غلام علی اور سردار وغیرہ جو اس کے مصاحب بنے ہوئے تھے، مطلبی انسان ہیں۔وہ ان سے جھڑکیاں، گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔اس نے مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے، میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں۔لیکن میں انہیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا الّو سیدھا ہو سکتا ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔

مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔میں نے سوچ رکھا ہے کہ جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیئے میں جا بیٹھوں گا۔رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بس یہ دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔کسی ایک کے مزار میں چلا جاؤں گا۔''

میں نے اس سے پوچھا: ''رنڈی کے کوٹھے اور تکیئے آپ کو کیوں پسند ہیں؟''

کچھ دیر سوچ کر اس نے جواب دیا: ''اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکہ ہی دھوکہ ہوتا ہے۔جو آدمی خود کو دھوکہ دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔''

میں نے ایک اور سوال کیا'' آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی

سمجھ رکھتے ہیں۔"

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سری سے کن سری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں۔۔۔ منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اڑس لیا۔ اس نے جھک کر اسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں انسان اپنے خدا سے۔"

بابو گوپی ناتھ کا شجرہ نسب تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اسے دس لاکھ روپے کی جائیداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اڑانا شروع کر دی۔ بمبئی آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار روپے لایا تھا۔ اس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں، لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو روپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لئے اس نے فیئٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا، لیکن شاید تین ہزار روپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مجھے تو صرف دلچسپی تھی، لیکن اسے مجھ سے کچھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت میرا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب، جب میں فلیٹ پر گیا تو مجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مراد کس آدمی سے ہے۔ یوں تو شفیق کافی مشہور آدمی ہے۔ کچھ اپنی جدت طرازگائکی کے باعث اور کچھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت۔ لیکن اس کی زندگی کا ایک حصہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بہت کم مشہور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی، اس لئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے، جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عمر ہے) کی عمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے، خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں، اس کی بذلہ سنج طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاج کی ایک جھلک تھی، بہت ہی جاذب نظر تھی۔ وہ کوشش کے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے زینت سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتاً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سینڈو ہی اسے لایا تھا۔ ان دونوں میں صلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا، وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سنا رہا تھا، جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا "او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گزر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا: "تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ" میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار، دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح۔ صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا۔ اس کے علاوہ...... کچھ یوں کہیئے کہ اس بات کا بھی اس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا، اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کچھ کہا لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آیئے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ، دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا: ''منٹو صاحب! مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے میں حضرت غوث اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں، میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لوٹ کر کھاتی رہیں مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گروی رکھ کر گزارہ کیا میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو جو کچھ وہ کرتی ہیں، سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہی ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا بمبئی لے جاؤ اسے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹریس بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گر سکھائے، غفار سائیں سے بھی یہ بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہو گی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو — منٹو صاحب! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بینک میں دس ہزار روپیہ جمع کرانے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہوئی سردار اس کی ایک ایک پائی اپنی جیب میں ڈال لے گی — آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے، سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس کے متعلق؟''

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا، لیکن بابو گوپی ناتھ نے خود ہی کہا: ''اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے — کیوں زینو جانی — پسند ہے تمہیں؟''

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض وغایت معلوم ہوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دور کردی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مال دار آدمی کی داشتہ بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہوتا تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا چونکہ اسکی نیت نیک تھی، اس لئے اس نے زینت کے مستقبل کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کو ایکٹریس بنانے کے لئے اس نے کئی جعلی ڈائرکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلی فون لگوایا۔ لیکن اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا: ''شفیق صاحب تو خالی خالی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسہ دیکھئے بے چاری زینت سے چار چادریں، چھ تکیئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سنا ہے آج کل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔''

یہ درست تھا۔ الماس، نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔

محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لایئے۔ میں نے اسے تلاش کیا، لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے تو اس نے جواب دیا: ’مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے، آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے — ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

شفیق سے مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپولو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں کیونکہ ان میں سے

ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا، زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ایک مہینہ گزر گیا لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے باربنی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یاسین بیٹھا تھا۔نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا: ''یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟''

یاسین مسکرایا: ''تم جانتے ہو موٹر والی کو۔''

میں نے کہا: ''جانتا ہوں۔''

''تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی — اچھی لڑکی ہے یار!'' یاسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرا دیا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یاسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ایک شام اپولو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یاسین نے زینت کو چھ بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کچھ دن اور گزر جائیں، زینت اور یاسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے — مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔اس کی جوان لڑکی میموریل سے یاسین کی آنکھ لڑ گئی۔ چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور یاسین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر دکھ ہوا۔اس نے مجھ سے کہا: ''منٹو صاحب! یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔لیکن زینت بھی عجیب ہے۔

اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر منہ سے اتنا بھی نہیں کہتی، میاں! اگر تم نے اس کرستان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کار کا بندوبست کرو، میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو۔ میں کیا کروں منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا — تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیے۔''

یاسین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی نئی بات وقوع پذیر نہ ہوئی ایک دن ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا بابو گوپی ناتھ، غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے، روپے کا بندوبست کرنے، کیونکہ

پچاس ہزار ختم ہو گئے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی۔ چنانچہ دونوں نے متحد کوشش کی اور ہر روز تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ، واپس نہیں آئے گا، اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہئے۔ سو سوا سو روپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا یہ تم کیا کر رہی ہو۔

اس نے بڑے الھڑپن سے کہا: ''مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔

جی چاہا کہ بہت دیر پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تم کر رہی ہو، ٹھیک نہیں، سینڈو اور سردار اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے، مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت اکتا دینے والی حد تک بے سمجھ، بے امنگ اور بے جان عورت تھی اس کم بخت کو اپنی زندگی کی قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے بہت کوفت ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔ سگریٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلی فون سے، حتّیٰ کہ اس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی، اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بابو گوپی ناتھ پورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ وہاں گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصّہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اسے پورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے کہہ دیا لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کہ دس ہزار روپیہ اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔

تقریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا: ''سینڈو!''

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ دھڑن تختہ۔

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ اور ساتھ چلو، لیکن سینڈو نے کہا

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجیے، مجھے آپ سے کچھ پرائیوٹ باتیں کرنی ہیں۔

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دور لے گیا دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا۔ ڈرائیور سے اس نے کہا "واپس لے چلو"

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا: "منٹو صاحب! زینو کی شادی ہونے والی ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا: "کس سے؟"

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا: "حیدرآباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خدا کرے وہ خوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہوا جو میں عین وقت پر آ پہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں، ان سے زینو کا زیور بن جائے گا — کیوں، کیا خیال ہے آپ کا؟"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہ تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ حیدرآباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے، سینڈو اور سردار کی کوئی جعلسازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدرآباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدرآباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھانے کی بے سود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے مربی غلام حسین (یہ اس حیدرآباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خوب خاطر مدارات کی۔ غلام حسین کی پرزور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے۔

گا کر سنائی۔ غلام حسین سو جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خوشی دُگنی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا: "منٹو صاحب: خوبصورت نوجوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش" کے حضور جا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو ہزار کے زیور اور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے اور پانچ ہزار نقد دیئے۔ محمد شفیق طوسی، محمد یاسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل، سینڈو، میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے دلہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھے۔

ایجاب وقبول ہوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا ''دھڑن تختہ''

غلام حسین سرج کا نیلا سوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مبارک باد دی جو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں اس کے سامنے چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لئے آیا تو اس نے مجھ سے بچوں کے سے انداز میں سے کہا: ''منٹو صاحب! ذرا اندر جائیے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔''

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔ زینت سرخ زربفت کا شلوار کرتہ پہنے تھی — دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی، چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ تھا حالانکہ مجھے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی سرخی بہت بری معلوم ہوتی ہے مگر زینت کے ہونٹ سجے ہوئے تھے اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھول ہی پھول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے زینت سے کہا یہ کیا مسخرہ پن ہے۔

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا: ''آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!'' اس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دکھ کے ساتھ مجھ سے کہا۔ ''منٹو صاحب! میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں — زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے کچھ تو سوچ لیا ہوتا۔''

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو اسے مجھ سے تھی، زخمی نظر آئی لیکن پیشتر اس کے کہ میں اس سے معافی مانگوں، اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا — ''خدا تمہیں خوش رکھے!''

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی — بہت ہی دکھ بھری ملامت — اور چلا گیا۔

برمی لڑکی

گیان کی شوٹنگ تھی اس لئے کفایت جلدی سو گیا۔ فلیٹ میں اور کوئی نہیں تھا۔ بیوی بچے راولپنڈی چلے گئے تھے۔ ہمسایوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یوں بھی بمبئی میں لوگوں کو اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کفایت نے اکیلے برانڈی کے چار پیگ پیے، کھانا کھایا، نوکروں کو رخصت کیا اور دروازہ بند کر کے سو گیا۔

رات کے پانچ بجے کے قریب کفایت کے خمار آلودہ کانوں کو دھک کی آواز سنائی دی اس نے آنکھیں کھولیں۔ نیچے بازار میں ایک ٹرام دندناتی ہوئی گزری۔ چند لمحات کے بعد دروازے پر بڑے زوروں کی دستک ہوئی۔ کفایت اٹھا۔ پلنگ سے اترا تو اس کے ننگے پیر ٹخنوں تک پانی میں چلے گئے۔ اس کو سخت حیرت ہوئی کہ کمرے میں اتنا پانی کہاں سے آیا اور باہر کوری ڈور میں اس سے بھی زیادہ پانی تھا۔ دروازے پر دستک جاری تھی۔ اس نے پانی کے متعلق سوچنا چھوڑا اور دروازہ کھولا۔

گیان نے زور سے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

کفایت نے جواب دیا۔ ''پانی''

''پانی نہیں ---- عورت!'' یہ کہہ کر گیان نیم اندھیرے میں کوری ڈور میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔

گیان کو فرش پر پھیلے ہوئے پانی کا کچھ احساس نہ ہوا۔ لڑکی نے پائجامہ اوپر اٹھا لیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی گیان کے پیچھے چلی گئی۔

کفایت کے ذہن میں پہلے پانی تھا۔ اب یہ لڑکی اس میں داخل ہو گئی اور ڈبکیاں لگانے

لگی۔ سب سے پہلے اس نے سوچا کہ یہ کون ہے؟ شکل صورت اور لباس کے اعتبار سے برمی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن گیان اسے کہاں سے لے آیا؟

گیان اندر کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے بغیر پلنگ پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی، مگر اس نے صرف ہوں ہاں میں جواب دیا اور آنکھیں نہ کھولیں۔ کفایت نے اس لڑکی کی طرف ایک نظر دیکھا جو سامنے والے پلنگ پر بیٹھی تھی اور باہر نکل گیا۔

باورچی خانے میں جا کر اسے معلوم ہوا کہ ربڑ کا وہ پائپ جو رات کو بڑا ڈرم بھرا کرتا تھا باہر نکلا ہوا ہے۔ تین بجے جب نل میں پانی آیا تو اس نے تمام کمرے سیراب کر دیئے۔

تینوں نوکر باہر گلی میں سو رہے تھے۔ کفایت نے ان کو جگایا اور پانی خارج کرنے کے کام پر لگا دیا۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ شریک تھا۔ سب چلوؤں سے پانی اٹھاتے تھے اور بالٹیوں میں ڈالتے جاتے تھے۔ اس برمی لڑکی نے جب ان کو یہ کام کرتے دیکھا تو جھٹ پٹ سینڈل اتار کر ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

اس کے چھوٹے چھوٹے گورے ہاتھ، انگلیوں کے ناخن بڑھائے ہوئے جو سرخی لگے نہیں تھے۔ چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے بال تھے۔ جن میں ہلکی ہلکی لہریں تھیں۔ مردار موضع کا مگر کھلا ریشمی پاجامہ پہنے تھی۔ اس پر سیاہ رنگ کا ریشمی کرتا تھا جس میں اس کی چھوٹی چھوٹی چھاتیاں چھپی ہوئی تھیں۔

جب اس نے ان لوگوں کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تو کفایت نے اسے منع کیا-----

"آپ تکلیف نہ کیجئے یہ کام ہو جائے گا"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چھوٹے چھوٹے سرخی لگے ہونٹوں سے مسکرائی اور کام میں لگی رہی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر تینوں کمروں سے پانی نکل گیا۔ کفایت نے سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا اسی بہانے سارا گھر دھل کر صاف ہو گیا۔"

وہ برمی لڑکی ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں چلی گئی۔ کفایت کمر سیدھی کرنے کے لئے بستر پر لیٹا، نیند پوری نہیں ہوئی تھی سو گیا۔

تقریباً نو بجے وہ جاگا اور جاگتے ہی اسے سب سے پہلے پانی کا خیال آیا، پھر اس نے برمی لڑکی کے متعلق سوچا جو گیان کے ساتھ آئی تھی۔ "کہیں خواب تو نہیں تھا۔ لیکن یہ سامنے گیان سو رہا ہے اور فرش بھی دھلا ہوا ہے"

کفایت نے غور سے گیان کی طرف دیکھا۔ وہ پتلون کوٹ بلکہ جوتے سمیت اوندھا سو رہا تھا۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے ایک آنکھ کھولی اور پوچھا۔ "کیا ہے؟"

"یہ لڑکی کون ہے؟"

گیان ایک دم چونکا "لڑکی ---- کہاں ہے" پھر فوراً ہی چت لیٹ گیا۔

"اوہ ---- بکواس نہ کرو ---- ٹھیک ہے"

کفایت نے اسے پھر جگانے کی کوشش کی مگر وہ خاموش سویا رہا۔ اس کو ساڑھے نو بجے اپنے کام پر جانا تھا۔ اس نے جلدی جلدی غسل کیا۔ شیو بھی غسل خانے کے اندر ہی کر لیا۔ باہر نکل کر ڈرائنگ روم گیا تو اس کو میز بجی ہوئی نظر آئی۔

صبح ناشتہ پر عام طور پر کفایت کے ہاں بہت ہی مختصر چیزیں ہوتی تھیں۔ دو ابلے ہوئے انڈے، دو توس، مکھن اور چائے ---- مگر آج میز رنگین تھی۔ اس نے غور سے دیکھا چھلے ہوئے انڈے عجیب وغریب انداز میں کٹے ہوئے تھے کہ پھول معلوم ہوتے تھے۔ سلاد تھا۔ بڑے خوبصورت طریقے سے پلیٹ میں سجا ہوا، توسوں پر بھی میناکاری کی ہوئی تھی۔ کفایت چکرا گیا۔ باورچی خانے میں گیا تو وہ برمی لڑکی چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے کچھ کچھ کہہ رہی تھی۔ تینوں نوکر اس کے اردگرد تھے اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ کفایت کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ برمی لڑکی نے آنکھیں گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

کفایت نے اس سے بات کرنا چاہی۔ لیکن وہ کیسے کرتا۔ اس سے کیا کہتا۔ وہ اس کو جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے اپنے ایک نوکر سے صرف اتنا پوچھا۔ "یہ ناشتہ آج کس نے تیار کیا ہے بشیر؟"

بشیر نے اس برمی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ "بائی جی نے"

وقت بہت کم تھا۔ کفایت نے جلدی جلدی بانکا سجیلا ناشتہ کھایا اور اپنے دفتر روانہ ہو گیا۔ شام کو واپس آیا تو وہ برمی لڑکی اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنا کرتہ استری کر رہی تھی۔ کفایت پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ وہ صرف پاجامہ پہنے تھی "آجایئے"

لہجہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ کفایت نے سوچا کہ برمی لڑکی کے بجائے شاید کوئی اور بولا ہے۔ جب وہ اندر گیا تو اس لڑکی نے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر کے اس کو سلام کیا۔ کفایت کی موجودگی میں اس نے کوئی حجاب محسوس نہ کیا۔ بڑے سکون سے وہ اپنا کرتہ استری کرتی رہی۔ کفایت نے دیکھا اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیوں کے درمیان حصے میں استری کی گرمی کے باعث پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمع ہو گئی تھیں۔

کفایت نے گیان کے بارے میں پوچھنے کے لئے بشیر کو آواز دینا چاہی مگر رک گیا۔ اس نے مناسب خیال نہ کیا کیونکہ وہ لڑکی آدھی ننگی تھی۔ اس نے ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھا۔

تھوڑی دیر اس نیم عریانی کو دیکھا مگر کوئی ہیجان محسوس نہ کیا ۔۔۔۔ لڑکی کا بدن بے داغ تھا۔ جلد نہایت ہی ملائم تھی۔ اتنی ملائم کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔

کرتا استری ہو گیا اس نے سوئچ اوف کیا۔ اور کھی کرتا تھا سفید بوسکی کا، جو تہہ کیا ہوا استری شدہ پاجامے پر رکھا تھا اس نے یہ سب کپڑے اٹھائے اور کفایت سے مخاطب ہوئی "میں نہانے چلی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ کفایت ٹوپی اتار کر سر کھجانے لگا۔ "کون ہے یہ؟"

اس کے دماغ میں بڑی کھد بد ہو رہی تھی۔ جب بھی وہ اس لڑکی کے متعلق سوچتا سارا واقعہ اس کے سامنے آجاتا۔ رات کو اس کا اٹھنا۔ پانی ہی پانی۔ اس کا دروازہ کھولنا اور کہنا "پانی" اور گیان کا یہ جواب دینا۔ "پانی نہیں عورت" اور ایک ننھی سی گڑیا کا چھم سے اندر آجانا۔

کفایت نے دل میں کہا "ہٹاؤ جی ۔۔۔ گیان آئے گا تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لونڈیا ہے دلچسپ ۔۔۔ اتنی چھوٹی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ آدمی جیب میں رکھ لے ۔۔۔ چلو برانڈی پئیں۔

بشیر نے گلاس، برانڈی اور برف وغیرہ سب کچھ ملاقاتی کمرے میں تپائی پر رکھ دیا تھا۔ کفایت نے کپڑے بدلے اور پینا شروع کر دی۔ پہلا پیگ ختم کیا تو اسے غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی "چوں" سنائی دی۔ دوسرا پیگ ڈال کر وہ انتظار کرنے لگا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ بری لڑکی ضرور ادھر آئے گی۔ اس کے مقررہ چار پیگ ختم ہو گئے مگر وہ نہ آئی، گیان بھی نہ آیا۔ کفایت جھنجھلا گیا۔ اندر بیڈ روم میں جا کر اس نے دیکھا وہ لڑکی استری کئے ہوئے کپڑے پہنے اپنی گول گول چھاتیوں پر ہاتھ رکھے بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ استری والی میز پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ بڑی اچھی طرح تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔

کفایت نے واپس جا کر برانڈی کا ایک ڈبل پیگ گلاس میں ڈالا اور نیٹ ہی چڑھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا سر گھومنے لگا۔ اس نے بری لڑکی کے متعلق سوچنے کی کوشش کی مگر اس نے ایسا محسوس کیا کہ وہ چلوؤں میں پانی بھر بھر کے اس کے دماغ میں ڈال رہی ہے۔ کھانا کھائے بغیر وہ صوفے پر لیٹ گیا اور اس بری لڑکی کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ صوفے کی بجائے اندر اپنے پلنگ پر ہے۔ اس نے حافظے پر زور دیا۔ "میں رات کب آیا یہاں ۔۔۔۔ کیا میں نے کھانا کھایا تھا؟"

کفایت کو جواب نہ ملا، سامنے والا پلنگ خالی تھا۔ اس نے زور سے بشیر کو آواز دی، وہ بھاگا اندر آیا۔ کفایت نے اس سے پوچھا۔ "گیان صاحب کہاں ہیں؟"

بشیر نے جواب دیا۔ ''رات کو نہیں آئے''

''کیوں''

''معلوم نہیں صاحب''

''وہ بائی جی کہاں ہیں؟''

''مچھلی تل رہی ہیں۔''

کفایت کے دماغ میں مچھلیاں تلی جانے لگیں۔ اٹھ کر باورچی خانے میں گیا تو وہ چوکی پر بیٹھی سامنے انگیٹھی رکھے مچھلی تل رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک چھوٹی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، ہاتھ اٹھا کر اس نے سلام کیا اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ کفایت نے دیکھا تینوں نوکر بے حد مسرور تھے اور بڑی مستعدی سے اس لڑکی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

بشیر کو کچھ دنوں کی چھٹی پر اپنے وطن جانا تھا۔ کئی دنوں سے وہ بار بار کہتا تھا کہ صاحب مجھے تنخواہ دے دیجئے، مجھے گھر سے کئی خط آچکے ہیں۔ والدہ بیمار ہے۔ رات کو وہ اسے ٹال گیا تھا۔ اب اسے یاد آیا تو اس نے بشیر سے کہا ''ادھر آؤ بشیر۔ اپنی تنخواہ لے لو، کل دفتر سے روپے لے آیا تھا۔

بشیر نے تنخواہ لے لی۔ کفایت نے اس سے کہا۔ ''نو بجے گاڑی جاتی ہے اس سے چلے جاؤ۔''

''اچھا جی!'' یہ کہہ کر بشیر چلا گیا۔

ناشتہ بے حد لذیذ تھا۔ خاص طور پر مچھلی کے ٹکڑے۔ اس نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بشیر کے ذریعے سے اس برمی لڑکی کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آئی۔ بشیر نے کہا۔ ''جی وہ کہتی ہیں بعد میں کریں گی وہ ناشتہ''

کفایت کی مالی حالت بہت پتلی تھی۔ گیان بھی آسودہ حال نہیں تھا دونوں ادھر ادھر سے پکڑ کر گزارہ کر رہے تھے۔ برانڈی کا بندوبست گیان کر دیتا تھا۔ باقی کھانے پینے کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا۔ جس فلم کمپنی میں گیان کام کر رہا تھا اس کا دیوالہ نکلنے کے قریب تھا۔ مگر اس کو یقین تھا کہ کوئی معجزہ ضرور رونما ہوگا اور اس کی کمپنی سنبھل جائے گی۔ شوٹنگ ہو رہی تھی غالباً اسی لئے گیان رات کو نہ آسکا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد کفایت نے جھانک کر باورچی خانے میں دیکھا۔ لڑکی اپنے کام میں مشغول تھی، تینوں ملازم لڑکے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ کفایت نے بشیر سے کہا۔ ''مچھلی بہت اچھی تھی''

لڑکی نے مڑ کر دیکھا اس کے ہونٹوں پر چھوٹی سی مسکراہٹ تھی۔

کفایت دفتر چلا گیا۔ اس کو امید تھی کہ کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائے گا۔ لیکن خالی جیب واپس آیا۔ بری لڑکی اندر بیڈ روم میں لیٹی تصویروں والا رسالہ دیکھ رہی تھی۔ کفایت کو دیکھ کر بیٹھ گئی اور سلام کیا۔

کفایت نے سلام کا جواب دیا اور اس سے پوچھا۔ ''گیان صاحب آئے تھے''

''آئے تھے دو پہر کو ----- کھانا کھا کر چلے گئے ----- پھر شام کو آئے۔ چند منٹوں کے لئے'' یہ کہہ کر اس نے ایک طرف ہٹ کر تکیہ اٹھایا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل نکالی۔ یہ دے گئے تھے کہ میں آپ کو دے دوں۔''

میں نے بوتل پکڑی، کاغذ پر گیان کے یہ چند الفاظ تھے۔ ''کم بخت یہ چیز کسی نہ کسی طرح مل جاتی ہے لیکن پیسہ نہیں ملتا ----- بہر حال عیش کرو ----- تمہارا گیان۔''

اس نے کاغذ کھولا۔ برانڈی کی بوتل تھی۔ بری لڑکی نے کفایت کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ کفایت بھی مسکرا دیا۔ ----- ''آپ پیتی ہیں؟''

لڑکی نے زور سے اپنا سر ہلایا ----- ''نہیں''

کفایت نے نظر بھر کر اس کو دیکھا اور سوچا۔ ''کیا چھوٹی سے ننھی منی گڑیا ہے!'' اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔ چنانچہ اس سے مخاطب ہوا۔ آیئے، ادھر دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں ----- میں کپڑے دھوؤں گی۔''

''اس وقت؟''

''اس وقت اچھا ہوتا ہے ----- رات دھوئے، صبح سوکھ گئے۔ اٹھتے ہی استری کر لئے۔

کفایت تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ اسے کوئی بات نہ سوجھی تو ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینا شروع کر دی۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے بری لڑکی کو بلایا۔ مگر اس نے کہا'' میں گیان صاحب کے ساتھ کھاؤں گی۔''

کفایت نے کھانا کھایا اور اپنے پلنگ پر سو گیا۔ رات کے تقریباً ایک بجے اس کی آنکھ کھلی۔ چاندنی رات تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا بھی بڑے مزے کی چل رہی تھی۔ کروٹ بدلی تو دیکھا سامنے پلنگ پر ایک چھوٹی سی سڈول گڑیا گیان کے چوڑے بالوں بھرے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ کفایت نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد گیان کی آواز آئی۔ ''جاؤ اب مجھے سونے دو ----- کپڑے پہن لو۔''

اس سپرنگوں والے پلنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ ریشم کی سرسراہٹیں کفایت کے کانوں میں داخل ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کفایت سو گیا۔ صبح چھ بجے اٹھا، کیونکہ وہ رات کو یہ سوچ کر سویا تھا کہ صبح جلدی اٹھے گا، کیونکہ اسے ٹرام کا بہت لمبا سفر طے کر کے ایک آدمی کے پاس جانا تھا جس سے اسے کچھ ملنے کی امید تھی۔ پلنگ پر سے اترا تو اس نے دیکھا کہ برمی لڑکی ننگے فرش پر اس کے سلیپنگ سوٹ کا اکلوتا پاجامہ پہنے اپنے چھوٹے سے سڈول بازو کو سر کے نیچے رکھے بڑے سکون سے سو رہی تھی۔ کفایت نے اس کو جگایا۔ اس نے اپنی کالی کالی آنکھیں کھولیں۔ کفایت نے اس سے کہا۔ ”آپ یہاں کیوں لیٹی ہیں۔“

اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر ننھی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، اٹھ کر اس نے جواب دیا۔ ”گیان کو عادت نہیں کسی کو اپنے ساتھ سلانے کی۔“

کفایت کو گیان کی اس عادت کا علم تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا۔ ”جائیے میرے پلنگ پر لیٹ جائیے۔“

لڑکی اٹھی اور کفایت کے پلنگ پر لیٹ گئی۔

کفایت غسل خانے میں گیا۔ وہاں رسّی پر برمی لڑکی کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ کفایت صابن مل کر نہانے لگا تو اس کا خیال اس لڑکی کے ملائم جسم کی طرف چلا گیا۔ جس پر سے نگاہیں پھسل پھسل جاتی تھیں۔

غسل سے فارغ ہو کر کفایت نے کپڑے پہنے۔ چونکہ جلدی میں تھا اس لئے گیان کو جگا کر اس سے کوئی بات نہ کر سکا۔ صبح کا نکلا رات کے گیارہ بجے واپس آیا۔ جیبیں خالی تھی۔ بیڈ روم میں گیا تو گیان اور برمی لڑکی دونوں اکٹھے لیٹے ہوئے تھے۔ کفایت نے ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر برانڈی پینی شروع کر دی۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ مایوس واپس آیا تھا۔ برمی لڑکی کے متعلق سوچتے سوچتے وہیں صوفے پر سو گیا۔ صبح پانچ بجے اٹھا۔ تپائی پر اس کا چوتھا پیگ پانی میں پڑا باسی ہو رہا تھا۔

کفایت اٹھا۔ بیڈ روم کے ننگے فرش پر برمی لڑکی سو رہی تھی۔ گیان الماری کے آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔ ٹائی کی گرہ ٹھیک کر کے اس نے دونوں ہاتھوں میں لڑکی کو اٹھایا اور اپنے پلنگ پر لٹا دیا۔ مڑا تو اس نے کفایت کو دیکھا۔

”کیوں بھئی کچھ بندوبست ہوا روپوں کا۔“

کفایت نے بڑی مایوسی سے کہا ”نہیں“

”تو میں جاتا ہوں ---- دیکھو شاید کچھ ہو جائے۔“

پیشتر اس کے کہ کفایت اسے روکے گیان تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ کھلا تو اس کی آواز آئی۔ ''تم بھی کوشش کرنا کفایت۔''

کفایت نے پلٹ کر پلنگ کی طرف دیکھا لڑکی بڑے سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے ننھے سے سینے پر چھوٹی چھوٹی گول گول چھاتیاں چمک رہی تھیں۔ کفایت کمرے سے نکل کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اندر رسی پر لڑکی کے دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے۔

غسل خانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا لڑکی نوکروں کے ساتھ ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی۔ ناشتہ کر کے باہر نکل گیا۔

چار روز اسی طرح گزر گئے۔ کفایت کو اس لڑکی کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گیان کبھی رات کو دیر سے آتا تھا، کبھی دن کو بہت جلدی نکل جاتا تھا۔ یہی حال کفایت کا تھا۔ دونوں پریشان تھے۔ پانچویں روز جب وہ اٹھا تو بشیر نے کفایت کو گیان کا رقعہ دیا۔ اس میں لکھا تھا ''خدا کے لئے کسی نہ کسی طرح دس روپے پیدا کر کے برمی لڑکی کو دے دو۔''

لڑکی کھڑی استری کر رہی تھی۔ بلاؤز کی صرف ایک آستین باقی رہ گئی تھی جس پر وہ بڑے سلیقے سے استری پھیر رہی تھی۔ کفایت نے اس کی طرف دیکھا۔ جب ان کی نگاہیں چار ہوئیں تو لڑکی مسکرا دی۔ کفایت سوچنے لگا کہ وہ دس روپے کہاں سے پیدا کرے۔ بشیر پاس کھڑا تھا۔ اس نے کفایت سے کہا۔ ''صاحب ادھر آیئے۔''

کفایت نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔''

''جی کچھ کہنا ہے۔''

بشیر نے ایک طرف ہٹ کر دس روپے کا نوٹ نکالا اور کفایت کو دے دیا۔ ''میں نہیں گیا ابھی تک صاحب۔''

کفایت نوٹ لے کر سوچنے لگا۔ ''نہیں نہیں — تم رکھو — لیکن تم گئے کیوں نہیں ابھی تک''

''صاحب چلا جاؤں گا کل پرسوں ---- آپ رکھئے یہ روپے۔''

کفایت نے نوٹ جیب میں ڈال لیا۔ اچھا شام کو لوٹا دوں گا تمہیں۔''

کپڑے وپڑے پہن کر جب برمی لڑکی ناشتہ کر چکی تو کفایت نے اس کو دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا۔

''گیان صاحب نے دیا تھا کہ آپ کو دے دوں۔''

لڑکی نے نوٹ لے لیا اور بشیر کو آواز دی۔ بشیر آیا تو اس سے کہا۔ ''جاؤ ٹیکسی لے آؤ۔''

بشیر چلا گیا تو کفایت نے اس سے پوچھا۔ ''آپ جا رہی ہیں۔''

''جی ہاں!''

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور بیڈروم میں چلی گئی وہ اپنا رومال استری کرنا بھول گئی تھی۔ کفایت نے اس سے باتیں کرنے کا ارادہ کیا تو ٹیکسی آ گئی رومال ہاتھ میں لے کر وہ روانہ ہونے لگی۔ کفایت کو سلام کیا اور کہا۔ ''اچھا جی ------ میں چلتی ہوں۔ گیان کو میرا سلام بول دینا۔''

پھر اس نے تینوں نوکروں سے ہاتھ ملایا اور چلی گئی۔ سب کے چہروں پر اداسی چھا گئی۔ پونے گھنٹے کے بعد گیان آیا۔ وہ کچھ لے کر آیا تھا۔ آتے ہی اس نے کفایت سے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ بری لڑکی!''

''چلی گئی''

''کیسے؟ دس روپے دیئے تھے تم نے اسے؟''

''ہاں''

''تو ٹھیک ہے ------ ٹھیک ہے!'' گیان کرسی پر بیٹھ گیا۔

کفایت نے پوچھا'' کون تھی یہ لڑکی''

''معلوم نہیں''

کفایت سرتاپا حیرت بن گیا'' کیا مطلب''

گیان نے جواب دیا۔'' مطلب یہی کہ میں نہیں جانتا کون تھی۔''

''جھوٹ!''

''تمہاری قسم سچ کہتا ہوں۔''

کفایت نے پوچھا۔'' کہاں سے مل گئی تمہیں''

گیان نے ٹانگیں میز پر رکھ دیں اور مسکرایا۔'' عجیب داستان ہے یار ------ پانی کا سیلاب آنے والی رات میں شنکر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں گیا۔ وہاں بہت پی۔ اندھیری اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوا تو سو گیا۔ گاڑی مجھے سیدھی چرچ گیٹ لے گئی۔ وہاں مجھے چوکیدار نے جگایا کہ اٹھو ------ میں نے کہا۔ بھئی مجھے گرانٹ روڈ جانا ہے۔ چوکیدار ہنسا۔ آپ پانچ اسٹیشن آگے چلے آئے ہیں۔ اترا، دوسرے پلیٹ فارم پر اندھیری جانے والی آخری گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہو گیا ------ گاڑی چلی تو پھر مجھے نیند آ گئی ------ سیدھا اندھیری پہنچ گیا۔''

کفایت نے پوچھا۔'' مگر اس سے لڑکی کا کیا تعلق''

''تم سن تو لو'' گیان نے سگریٹ سلگایا۔ ''اندھیری پہنچا یعنی جب میری آنکھ کھلی تو دیکھتا ہوں کہ میں ایک چھوٹی سی لونڈیا کے ساتھ چمٹا ہوں۔ پہلے تو میں ڈرا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ کون ہو تم؟ ------ وہ مسکرائی۔ میں نے پھر پوچھا۔ کون ہو بھئی تم ------ وہ مسکرائی اور کہنے لگی تم اتنی دیر سے مجھے چومتے رہے اور اب پوچھتے ہو میں کون ہوں ------ میں نے حیرت سے کہا اچھا ------ وہ ہنسنے لگی۔ میں نے دماغ پر زور دے کر سوچنا مناسب خیال نہ کیا اور اس کو اپنے ساتھ بھینچ لیا ------ صبح تین بجے تک ہم دونوں پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر سوئے رہے، ساڑھے تین بجے پہلی گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو گئے میرا ارادہ تھا کہ بندوبست کر کے اس کو کچھ روپے دوں گا ------ یہاں پہنچے تو پانی کا طوفان آیا ہوا تھا ------ ہے نا ------ دلچسپ داستان۔''

کفایت نے کہا۔ ''خاصی دلچسپ ہے۔ مگر وہ اتنے دن کیوں رہی یہاں؟''

گیان نے سگریٹ فرش پر پھینکا۔ ''وہ کہاں رہی۔ میں نے اسے رکھا۔ اصل میں وہ یوں رہی کہ میرے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو اسے دیتا۔ بس دن گزرتے گئے۔ میں بے حد شرمندہ تھا۔ کل رات میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ دیکھو بھئی دن بڑھتے جا رہے ہیں۔ تم ایسا کرو۔ مجھے اپنا ایڈریس دے دو۔ میں تمہارا حق تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ آج کل میرا حال بہت پتلا ہے۔''

کفایت نے پوچھا۔ ''یہ سن کر اس نے کیا کہا؟''

گیان نے سر کو جنبش دی ''عجیب ہی لڑکی تھی ------ کہنے لگی، یہ کیا کہتے ہو ------ میں نے تم سے کب مانگا ہے ------ لیکن دس روپے مجھے دے دینا ------ میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ ٹیکسی میں جاؤں گی۔ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔''

کفایت نے سوال کیا۔ ''نام کیا تھا اس کا؟''

گیان سوچنے لگا۔

''بھول گئے؟''

گیان نے اپنی ٹانگیں میز پر سے ہٹائیں۔ نہیں یار ------ میں نے اس سے نام نہیں پوچھا۔

حد ہو گئی۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔

(۱۰؍ جون ۱۹۵۰ء)

بُو

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ ساگوان کے اس اسپرنگوں والے پلنگ پر جواب کھڑکی کے پاس سے ذرا ادھر کو سرکا دیا گیا تھا، ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی ہوئی تھی۔

شام کے قریب، دن بھر ایک انگریزی اخبار کی تمام خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو جو غالباً ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لئے املی کے درخت کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور آخر میں ہاتھ کے اشارے سے اسے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دنوں سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی قریب قریب تمام کرسچین چھوکریاں جو پہلے سستے داموں پر مل جاتی تھیں، عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فورٹ کے علاقے میں ڈانسنگ اسکول کھول لئے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی ــــ رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں، دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ رندھیر جو فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا، صرف اس لئے اس پر فورٹ کے اکثر قحبہ خانوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کے گرد و نواح کی کئی کرسچین لڑکیوں سے جسمانی ملاقات کر چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسی ملاقات کے آداب سے وہ ان کرسچین لونڈوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ واقفیت رکھتا ہے جن سے یہ لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔

رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہیزل سے اس کی تازہ تازہ پیدا شدہ رعونت کا بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح کو وردی پہن کر اور اپنے کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے پر جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جانے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر وہ کیوں ان کرسچن چھوکریوں کی طرف اتنا راغب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابلِ نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سُناتی ہیں۔ جب ڈانس کی دُھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں — یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی عورت بھی ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔

رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا تو اسے ہرگز ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اس کو اپنے ساتھ سلا سکے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد جب اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو بیچاری کو نمونیہ ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا کہ: "یہ کپڑے اتار دو، سردی لگ جائے گی......"

وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی کیونکہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے مگر بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی سفید دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا جس کا میل بھیگنے کے باعث اور زیادہ اُبھر آیا تھا — کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے سفید دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش شروع کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ یہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔

دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گرہ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بارش کے پانی سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک کر ہار گئی تو اس نے مرہٹی زبان میں

رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا: ''میں کیا کروں، نہیں کھلتی......''

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا اور زور سے کھینچا۔ گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔ رندھیر نے ایک لمحے کے لئے خیال کیا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو چابکدست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے یہ عجیب و غریب چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہونے کے باوجود چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ اُبھار دیئے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی کے اندر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے کپکپا رہے تھے۔ اس گھاٹن لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی سے شرابور ہو چکے تھے، ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں نائیوں کے غلیظ مگر گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔

ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔ دونوں گویا ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بمشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی کیونکہ جو کچھ انھیں کہنا سننا تھا، سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہوتا رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جو ان کے اردگرد ایک کالے دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے جاگ اُٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لمحے کے لئے کپکپا اُٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں مرتبہ تعارف ہو چکا تھا۔ وہ اس کی لذت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم اور سخت سینوں کے ساتھ اپنا سینہ ملا کر وہ ایسی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل الھڑ تھیں اور اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ

تمام باتیں سُنادیا کرتی تھیں جو کسی غیر کو نہیں سُنانا چاہئیں ۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی رشتہ قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت خود کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں مگر یہ گھاٹن لڑکی جو املی کے درخت کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جس کو اس نے اشارے سے اوپر بلالیا تھا، بہت ہی مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے بدن سے عجیب و غریب قسم کی بُو آتی رہی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو اور بدبُو تھی، وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، ہر جگہ سے یہ بُو جو بدبُو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے ہر سانس میں موجود تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی، اگر اس کے ننگے بدن سے یہ بُو نہ اُڑتی —— یہ بُو جو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ گئی تھی، اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بُو نے اس لڑکی کو اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے، عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے، ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی، جو مائل پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی —— وہ دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

اس بُو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلی تھی، رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کرسکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے، لیکن نہیں، وہ بُو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا۔ وہ بالکل اصلی تھی —— عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بُو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بُو دب جائے لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار، ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی کی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی بلکہ اسے عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرم نرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے بھی وہی بُو نکلی تھی جو غایت درجہ قابلِ فہم ہونے کے باوجود ناقابلِ فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو یہ مطلب سمجھا نہیں سکتا۔

برسات کے یہی دن تھے...... اسی کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہا رہے تھے، ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑپھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی دھندلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہے ــــ برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اسی کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے، موسم بھی بالکل ایسا ہی تھا، بارش کے قطروں کے ساتھ تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی بھی اتر رہی تھی مگر فضا میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔ اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے مُنہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا، ایک گوری چٹی لڑکی اپنے سَتر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی ــــ اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کے گہرے سُرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ اس پلنگ پر اس کے دوسرے اُترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس کی سنہرے پھولوں والی قمیض، انگیا، جانگیا اور دوپٹہ ــــ سب کا رنگ سُرخ تھا، بے حد سُرخ۔ یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔

لڑکی کے سیاہ بالوں میں مقیش کے ذرّے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے، سُرخی اور مقیش کے ان ذرّات نے مل جُل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا، بے جان سا، اُڑا اُڑا اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبّے ڈال دیے تھے۔

چھاتیاں دُودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی ہوتی ہے۔ بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سُرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔ رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا: کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اسے لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے، کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح کیونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں اور چینی کے برتنوں پر ہلنے جلنے سے خراشیں آ جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر کئی جگہ ایسے نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چُست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے اردگرد کس کر بندھے ہوئے ازار بند کا نشان ــــ وزنی اور نوکیلے جڑاؤ نکلیس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پیدا ہو گئی تھیں جیسے

ناخنوں سے بڑے زور کے ساتھ کھجایا گیا ہو۔ برسات کے وہی دن تھے پیپل کی نرم نرم کومل پتیوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی کہ رندھیر اس روز تمام رات سنتا رہا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کئے۔ اس نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں اسے سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا۔ جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے چھیڑے ہوئے تاروں کی آواز سُنی ـــــ لیکن وہ پکار کہاں تھی، وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی، وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچّے کے رونے سے کہیں زیادہ قابلِ فہم تھی، وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار دُور بہت دُور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اسے مٹیلے بادلوں میں ایک عجیب قسم کی دُھندلی روشنی گھلی ہوئی دکھائی دیتی تھی، جیسے اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی، ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم تھا، لیٹی تھی۔ اس کے سوئے ہوئے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی جو اب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالتِ نزا کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ اس میں کچھ کھٹاس سی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھٹاس جو بدہضمی کی ڈکاروں میں ہوتی ہے۔ اداس، بے رنگ، بے کیف۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبّوں کی صورت میں۔ اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بُو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکلی تھی۔ وہ بُو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دُور رس تھی، جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا، جو خود بخود ناک کے رستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی۔ اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی اے تک تعلیم پائی تھی اور جو اپنے کالج میں سینکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی، رندھیر کی نبض تیز نہ کر سکی —— وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بُو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انہی دنوں میں جب کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے، اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی۔

پھاہا

گوپال کی ران پر جب یہ بڑا پھوڑا نکلا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ آم خوب ہوئے تھے۔ بازاروں میں، گلیوں میں، دکانداروں کے پاس، پھیری والوں کے پاس، جدھر دیکھو آم ہی آم نظر آتے۔ لال، پیلے، سبز، رنگا رنگ کے — سبزی منڈی میں لاکھوں کے حساب سے ہر قسم کے آم آتے تھے اور نہایت سستے داموں پر فروخت ہو رہے تھے۔ یوں سمجھئے کہ پچھلے برس کی کسر پوری ہو رہی تھی۔

اسکول کے باہر چھوٹو رام پھل فروش سے گوپال نے ایک روز خوب جی بھر کے آم کھائے اور جیب میں سے ایک مہینے کے بچائے ہوئے جتنے پیسے جمع تھے۔ سب کے سب ان آموں پر خرچ کر دیے۔ جن کے گودے اور رس میں شہد گھلا ہوا تھا۔

اس روز چھٹی کے وقت آم کھانے کے بعد انگلیاں چاٹتے ہوئے گوپال کو اسکول کے حلوائی سے دودھ کی لسی پینے کا خیال آیا تھا اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اس نے گنڈا رام حلوائی سے پاؤ بھر دودھ کی لسی بنانے کو کہا بھی تھا مگر حلوائی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا۔ ''بابو گوپال، پہلا حساب چکا دو تو اور ادھار دوں گا، ورنہ نہیں۔''

گوپال نے اگر آم نہ کھائے ہوتے۔ یا اگر اس کی جیب میں تھوڑے بہت پیسے ہوتے تو وہ وہیں کھڑے کھڑے گنڈا رام کا حساب چکا دیتا اور کچھ نہیں تو نقد دام دے کر لسی کا وہ گلاس لے لیتا۔ جس میں برف کا ٹکڑا ڈبکیاں لگا رہا تھا اور جسے حلوائی نے برا سا منہ بنا کر اپنے پیچھے لوہے کے تھال پر رکھ دیا تھا مگر گوپال، کچھ بھی نہ کر سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھے روز اس کی ران پر یہ

بڑا سا پھوڑا نکل آیا اور تین چار روز تک ابھرتا رہا۔

گوپال کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے؟ وہ پھوڑے سے اتنا پریشان نہیں تھا جتنا اس کے درد سے — اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ پھوڑا دن بہ دن لال ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کے منہ پر بدن کی جھلی پھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ بعض اوقات گوپال کو یہ معلوم ہوتا کہ پھوڑے کے اندر کوئی ہنڈیا اُبل رہی ہے اور اس کے اندر سب کچھ ایک ہی اُبال میں نکلنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اسے بہت پریشان کر رہی تھی اور پھوڑے کی جسامت دیکھ کر ایک مرتبہ تو اسے ایسا معلوم ہوا تھا کہ اس کی جیب میں سے کانچ کی گولی نکل کر اس کی ران میں گھس گئی ہے۔

گوپال نے گھر میں پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پتا جی کو اس کا پتہ چل گیا تو وہ اپنے تھانے کی مکھیوں کا سارا غصہ اسی پر نکالیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اسے اس چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیں جو تھوڑے روز ہوئے گردھاری وکیل کے منشی نے وزیر آباد سے انہیں تحفے کے طور پر لا کر دی تھی۔ ماں کا مزاج بھی کم گرم نہ تھا۔ وہ اگر اسے آم کھانے کے جُرم کی سزا نہ دیتی تو اس غلطی پر اس کے کان کھینچ کھینچ کر ضرور لال کر دیتی کہ اس نے گھر کے باہر اکیلے اکیلے اتنے آم کیوں اڑائے۔ اس کی ماں کا اصول تھا کہ ''گوپال اگر تجھے زہر بھی کھانا ہو تو گھر میں کھا۔'' گوپال اچھی طرح جانتا تھا کہ اس اصول کے پیچھے اس کی ماں کی صرف یہ خواہش تھی کہ گوپال کے منہ کے ساتھ اس کا منہ بھی چلتا رہے۔

کچھ بھی ہو، گوپال کی ران پر پھوڑا نکلنا تھا نکل آیا۔ اس کا باعث جہاں تک گوپال سمجھ سکا تھا۔ وہی آم تھے۔ اس نے پھوڑے کی بابت گھر میں کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ اس کو اپنے پتا جی کو وہ ڈانٹ اچھی طرح یاد تھی جو غسل خانے کے اندر بتائی گئی تھی۔ اس کے پتا جی لالہ پرشوتم داس تھانے دار لنگوٹ باندھے نل کی دھار کے نیچے اپنی گنجی چندیا رکھے اور بڑی توند بڑھائے مونچھوں میں سے آم کا رس چوس رہے تھے۔ سامنے بالٹی میں ایک درجن کے قریب آم پڑے تھے جو اس نے صبح سویرے ایک ٹھیلے والے سے اس کا چالان کاٹ کر حاصل کئے تھے۔ گوپال باپ کی پیٹھ مل رہا تھا اور میل کی مروڑیاں بنا رہا تھا۔ جب اس نے ہاتھ صاف کرنے کے لئے بالٹی میں ڈالے تھے اور چپکے سے ایک آم اڑانا چاہا تھا تو لالہ جی نے بڑے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر چھوٹے سے آم کو مونچھوں سمیت منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تھا ''بے شرم —— تجھے بڑوں کا لحاظ کرنا، جانے کب آئے گا؟''

اور جب گوپال نے رونی صورت بنا کر کہا تھا۔ ''پتا جی — آم کھانے کو میرا بھی تو جی چاہتا ہے۔'' تو تھانیدار صاحب نے آم کی گٹھلی چوس کر موری میں پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ ''گوپا،

تیرے لئے یہ آم بہت گرم تھا۔ پھوڑے پھنسیاں چاہتا ہے تو بیشک کھالے ــــــ دو تین بارشیں اور ہو لینے دے، پھر خوب ٹھاٹ سے کھائیو، تیری ماں سے کہوں گا۔ وہ لسی بنا دے گی ــــــ چل اب پیٹھ مل۔'' اور گوپال نے یہ رکاوٹ کی بات سن کر خاموشی سے اپنے پتا کی پیٹھ ملنا شروع کر دی تھی اور آم کی کھٹاس نے جو پانی اس کے منہ میں بھر دیا تھا۔ اسے دیر تک نگلتا رہا تھا۔

اس کے دوسرے روز اس نے آم کھائے اور چوتھے روز اس کی ران پر پھوڑا نکل آیا۔ اس کے پتا کی بات سچی ثابت ہوئی۔

اب اگر گوپال گھر میں کسی سے اس پھوڑے کی بات کرتا تو ظاہر ہے کہ خوب پٹتا۔ یہی وجہ ہے، کہ وہ خاموش رہا اور پھوڑے کا بڑھاؤ بند کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔

ایک روز اس کے پتا جی تھانے سے واپسی پر جب گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک لمبی سے بتی تھی۔ گوپال کی ماں کو آواز دے کر انہوں نے یہ بتی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔'' لے آج بڑے کام کی چیز لایا ہوں۔ بمبئی کا مرہم ہے۔ سو دواؤں کی ایک دوا ہے ــــ پھوڑے پھنسی کی بہار ہے۔ ذرا سا پھاہے پر لیپ کر کے لگا دو گی، یوں آرام آجائے گا ــــ یوں ــــ بمبئی کا'' نخالص ''مرہم ہے۔ اسے سنبھال کے رکھ!''

گوپال اپنی بہن نرملا کے ساتھ صحن میں گیند بلا کھیل رہا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب تھانیدار جی مرہم دے کر اپنی پتنی کو کچھ سمجھا رہے تھے تو نرملا نے زور سے گیند پھینکی گوپال کا دھیان باپ کی طرف تھا۔ گیند زور سے پھوڑے پر لگی۔ گوپال بلبلا اٹھا۔ لیکن درد کو اندر ہی اندر پی گیا۔ وہ اسکول میں ماسٹر ہری رام کے مشہور بید کی مار کھا کر درد سہنے کا عادی ہو چکا تھا۔

ادھر گوپال کے پھوڑے پر گیند لگی۔ ادھر اس کے باپ کی آواز بلند ہوئی۔'' ذرا سا پھاہے پر لیپ کر کے لگا دو گی ــــ یوں آرام آجائے گا ــــ یوں۔'' اور یوں کے ساتھ اس کے باپ کی چٹکی نے گویا گوپال کے سوئے ہوئے دماغ کی چٹکی بھر لی۔ اس کو اپنے درد کا علاج معلوم ہو گیا۔

اس کی ماں نے مرہم کی بتی سامنے دالان میں سلائی کی پٹاری میں رکھ دی۔ گوپال کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی ماں عام طور پر سلائی کی پٹاری ہی میں سب سنبھالنے والی چیزیں رکھا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ سنبھالنے والی چیز وہ موچنا تھا۔ جس سے اس کی ماں ہر دسویں پندرھویں روز اپنے تنگ ماتھے کے بال صاف کیا کرتی تھی۔ یہ بلاشک وشبہ سلائی کی پٹاری میں اس پڑیا سمیت موجود تھا۔ جس میں کوئلوں کی سفید راکھ جمع رہتی تھی۔ جو اس کی ماں بال نوچ کر ماتھے پر لگایا کرتی تھی۔

تاہم گوپال نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے گیند دالان میں پھینک دی۔ اور اس کو پلنگ کے نیچے سے نکالتے ہوئے اپنی ماں کو سلائی کی پٹاری میں مرہم رکھتے دیکھ لیا۔

دوپہر کو اس نے اپنی بہن نرملا کو ساتھ ملا کر چھوٹی قینچی، جس سے اس کا باپ انگلیوں کے ناخن کاٹتا تھا۔ مرہم کی بتی اور اپنے باپ کے پائجامے سے بچا ہوا لٹھے کا وہ ٹکڑا حاصل کر لیا ......جس سے اس کی ماں ایک اور ٹکڑے کو ساتھ ملا کر شلوار کی میانی بنانا چاہتی تھی۔

دونوں یہ چیزیں لے کو اوپر کوٹھے پر چلے گئے اور برساتی کے نیچے کوئلوں کی بوریوں کے پاس بیٹھ گئے۔

نرملا نے اپنی جیب سے لٹھے کا ٹکڑا نکال کر اپنی ران پر شلوار کے پھسلتے ہوئے ریشمی کپڑے پر پھیلا کر جب گوپال کی طرف اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ گیارہ برس کی یہ کمسن لڑکی جو دریائی سرکنڈے کی طرح نازک اور لچکیلی تھی۔ ایک بہت بڑے کام کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہی ہے۔

اس کا ننھا سا دل جو اس وقت تک صرف ماں باپ کی جھڑکیوں اور اپنی گڑیوں کے میلے ہوتے ہوئے چہروں کی فکر سے دھڑکا کرتا تھا۔ اب اپنے بھائی کی ران پر پھوڑا دیکھنے کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے کان کی لویں لال اور گرم ہو گئی تھیں۔

گوپال نے گھر میں اپنے پھوڑے کی بابت کسی سے ذکر نہ کیا تھا۔ لیکن اب اسے نرملا کو ساری بات سنانا پڑی کہ کس طرح اس نے چوری چوری آم کھائے اور لسی پینا بھول گیا اور اس کی ران پر پیسے کے برابر پھوڑا نکل آیا۔ جب اس نے اپنی رام کہانی سنا کر نرملا سے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔ "دیکھ، نرملا! گھر میں یہ بات کسی سے نہ کہیو۔" تو نرملا نے بڑی متین صورت بنا کر جواب دیا تھا۔ "میں پاگل تھوڑی ہوں۔"

گوپال کو یقین تھا کہ نرملا یہ بات اپنے تک ہی رکھے گی۔ چنانچہ اس نے پاجامے کو اوپر اڑس لیا۔ نرملا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جب گوپال نے بیٹھ کر اپنا پھوڑا دکھایا اور نرملا نے دور ہی سے اپنی انگلی سے اسے چھوا۔ تو اس کے بدن پر ایک جھرجھری سی طاری ہو گئی۔ سی سی کرتے ہوئے اس نے اس اُبھرے ہوئے لال پھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کتنا لال ہے۔"

"ابھی تو اور ہو گا۔" گوپال نے اپنے مردانہ حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

نرملا نے حیرت سے کہا۔ "سچ؟"

"ابھی تو کچھ لال نہیں ہے، جو پھوڑا میں نے چرنجی کے منہ پر دیکھا ہے۔ وہ اس سے

کہیں زیادہ بڑا اور لال تھا۔'' گوپال نے پھوڑے پر دو انگلیاں پھیریں۔

''تو ابھی اور بڑھے گا؟'' نرملا آگے سرک آئی۔

''کیا پتا ہے — ابھی تو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔'' گوپال نے جیب میں سے مرہم کی بتی نکال کر کہا۔

نرملا سہم سی گئی۔ ''اس مرہم سے تو آرام آجائے گا نا؟''

گوپال نے بتی کے ایک سرے پر سے کاغذ کی تہہ جدا کی اور اثبات میں سر ہلا دیا ''اس کا ایک پھاہا لگانے ہی سے پھٹ جائے گا۔''

''پھٹ جائے گا!'' نرملا کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے کان کے پاس ربڑ کا غبارہ پھٹ گیا ہے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''اور اس کے اندر جو کچھ ہے پھوٹ بہے گا!'' گوپال نے مرہم کو انگلی پر اٹھاتے ہوئے کہا۔

نرملا کا گلابی رنگ اب بمبئی کے مرہم کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ ''مگر یہ پھوڑے کیوں نکلتے ہیں بھیا؟''

''گرم چیزیں کھانے سے!'' گوپال نے ایک ماہر طبیب کے سے انداز میں جواب دیا۔

نرملا کو وہ دو انڈے یاد آگئے جو اس نے دو ماہ پہلے کھائے تھے، وہ کچھ سوچنے لگی۔

گوپال اور نرملا کے درمیان چند باتیں اور ہوئیں۔ اس کے بعد وہ اصلی کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ نرملا نے لٹھے کا ایک گول پھاہا کاٹا۔ بڑی نفاست سے، یہ روپے کے برابر تھا اور اس کی گولائی میں مجال ہے جو ذرا سا نقص بھی ہو۔ اسی طرح گول تھا جس طرح نرملا کی ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی روٹی گول ہوتی تھی۔

گوپال نے اس پھاہے پر تھوڑا سا مرہم لگا دیا اور اسے اچھی طرح پھیلانے کے بعد پھوڑے کی طرف غور سے دیکھا۔ نرملا گوپال کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور گوپال کی ہر حرکت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ گوپال نے جب پھاہا اپنے پھوڑے کے اوپر جما دیا تو وہ کانپ گئی جیسے اس کے بدن پر کسی نے برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہے۔

''اب آرام آجائے گا نا؟'' نرملا نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

گوپال جواب دینے بھی نہ پایا تھا کہ برساتی کے برابر والی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ یہ ان کی ماں تھی جو غالباً کو کلے لینے کے لئے آرہی تھی۔

گوپال اور نرملا نے بیک وقت ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر سب چیزیں اکٹھی کر کے اس پرانے صندوق کے نیچے چھپا دیں۔ جہاں ان کی بلّی سُندری بچے دیا کرتی تھی اور چپکے سے بھاگ گئے۔

یہاں سے بھاگ کر گوپال جب نیچے گیا تو اس کے باپ نے اسے باہر فالودہ لانے کے لئے بھیج دیا۔ جب واپس آیا تو اسے گلی میں نرملا ملی۔ فالودے کا گلاس اس کے حوالے کر کے وہ چرنجی کے گھر چلا گیا اور اس طرح ان چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا بھول گیا جو ماں کے اچانک آجانے سے اس نے اور نرملا نے صندوق کے پیچھے چھپا دی تھیں۔

چرنجی کے یہاں وہ دیر تک تاش کھیلتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر جب وہ چرنجی کی بغل میں ہاتھ ڈالے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو کسی بات پر اس کا دوست ہنسا اور اس کے داہنے گال پر پھوڑے کا نشان لمبی سے لکیر بن گیا۔ اور اس کو دیکھ کر فوراً ہی اپنے پھوڑے کا گوپال کو خیال آیا اور اس خیال کے ساتھ ہی اسے وہ چیزیں یاد آگئیں جو صندوق کے پیچھے پڑی تھیں۔ چرنجی کی بغل سے ہاتھ نکال کر وہ بھاگا۔

گھر پہنچ کر اس نے وہاں کی فضا دیکھی۔ اس کی ماں صحن میں بیٹھی اس کے باپ سے ''ملاپ'' اخبار کی خبریں سن رہی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ گوپال ان کے پاس سے گزرا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ مگر اس سے کوئی بات نہ کی۔ گوپال کو اطمینان ہو گیا کہ ابھی تک اس کی ماں نے اپنی سلائی کی پٹاری نہیں دیکھی۔ چنانچہ وہ چپکے سے کوٹھے پر چلا گیا۔

بڑے کوٹھے کو طے کر کے دروازے کے اندر داخل ہونے والا ہی تھا کہ اس کے قدم رک گئے۔

صندوق کے پاس بیٹھی نرملا کچھ کر رہی تھی۔ گوپال پیچھے ہٹ گیا اور چھپ کر دیکھنے لگا۔

نرملا بڑے انہماک سے پھاہا تراش رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں قینچی سے بڑا نفیس کام لے رہی تھیں۔ پھاہا کاٹنے کے بعد اس نے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس پر پھیلایا اور گردن جھکا کر اپنے کرتے کے بٹن کھولے۔ سینے کے داہنی طرف چھوٹا سا ابھار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکی پر صابن کا چھوٹا سا نا مکمل بلبلہ اٹکا ہوا ہے۔

نرملا نے پھاہے پر پھونک ماری اور اسے اس ننھے سے ابھار پر جما دیا۔

پھندنے

کوٹھی سے ملحقہ وسیع و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلی نے بچے دیئے تھے جو بلا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کُتیا نے بچے دیئے تھے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے اور دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا — ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی — ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔

جانے کتنے برس گزر چکے تھے — کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری بیونتی، کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیئے تھے جن کا نام و نشان بھی نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بد عادت مرغیاں وہاں انڈے دے دیا کرتی تھیں جن کو ہر صبح اٹھا کر وہ اندر لے جاتی تھی۔

اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا — اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمی ازار بند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا، پھنسا ہوا تھا اس زور سے قاتل نے پیچ دیئے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہو گئی تھی — اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن نہیں، ایسا کیونکر ہو سکتا تھا، اس لئے کہ اس قتل کے دیر بعد مرغیوں نے انڈے، نہیں بلیوں نے بچے دیئے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی — کُتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔ مُکیشی — جھلمل جھلمل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں تھیں، اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا — سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی مشکیں بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنہیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے — پر جب صبح ہوئی تھی تو ان کا نام ونشان تک نہیں تھا — سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔

دلہن کو جانے کیا سوجھی، کم بخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں، اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا — جو بڑا اگل گوتھنا، لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مر گئی —— باپ بھی — دونوں کو بچے نے مارا — اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکائے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلّے گھومتے تھے جو اسے گھورتے تھے، اس کو چھچھڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا مگر نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں — مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔

اب کتے بھونکنے لگے — نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے ہر فرش پر اچھلیں ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں — کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔

جانے کیا ہوا ان کتوں میں دو زہر کھا کے مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان ملازمہ کی جگہ آئی تھی جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا، گلے میں اس کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندا ڈال کر۔

اس کی ماں تھی۔ ادھیڑ عمر کی ملازمہ سے عمر میں چھ سات برس بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی نہیں تھی۔ ہر روز صبح شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی۔ اور بد عادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔

آملیٹ بناتی تھی جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتے تو ان کو باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سہیلی آئی — پاکستان میل موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل۔ بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی ہوئی تھیں — پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں

داخل ہوتے ہی اپنا بلاؤز اتارا اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ اُبلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ اُبلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ بل بل کے گنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئے۔

اس سہیلی کا بینڈ بج گیا۔ مگر وہ وردی والے سپاہی پھُندنے نچانے نہ آئے۔ ان کی جگہ پیتل کے برتن تھے، چھوٹے اور بڑے، جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرجدار اور دھیمی۔۔۔ دھیمی اور گرجدار۔

یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔

پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا۔۔۔ ادھیڑ عمر کی ہنس مکھ ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اس کو بہت دلاسا دیا۔ بیچاری کو اپنی شادی یاد آ گئی تھی۔

رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی۔ وہ روتی رہی، وہ ہنستا رہا۔۔۔ صبح ہوئی تو ادھیڑ عمر کی ہنس مکھ ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسا دینے کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلایا گیا۔۔۔ اس کی شلوار میں اس کا لال پھُندنوں والا ازار بند پڑا تھا۔۔۔ معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھا گیا۔

اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں۔۔۔ اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا۔ مگر پہلا تو ابھی تک اترا نہیں۔۔۔ ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو۔ جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

اس کی ماں موٹر ڈرائیوری سیکھ رہی ہے۔۔۔ باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہنس مکھ ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اسے دلاسا دیتا ہے، وہ اسے پچکارتی ہے۔ اور دلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دلہن بھابی، دونوں سیر کو جاتی ہیں۔۔۔ سہیلی بھی، پاکستان میل۔ موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل۔۔۔ سیر کرتے کرتے اجنتا جا نکلتی ہیں جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویر بن جاتی ہیں۔ رنگ ہی رنگ، لال، پیلے، ہرے، نیلے۔۔۔ سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو ان رنگوں کا خالق چپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ سردیوں اور گرمیوں میں اوور کوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل و صورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں

استعمال کرتا ہے — اپنے رنگوں کو چپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کراتی ہیں اور بعد میں خود چلّانے لگتی ہیں۔

تینوں اجنتا میں مجرد آرٹ کے سینکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دو پیٹ ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے — دوسری کی تصویروں میں عورت ادھیڑ عمر کی ہوتی ہے۔ ہٹی کٹی۔ تیسری کی تصویروں میں پھندنے ہی پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔

مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے — بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنے بلاؤز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔

اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا۔

ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی اسٹینوگرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش اجنتا اسٹوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ اسٹکیں اس کے بکھیرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی، اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی۔

اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف رنگ کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہو جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ۔ عقب میں چلے جاؤ تو کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر — ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ساس سے بھرا ہوا مرتبان — اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ۔ نیچے سے دیکھو تو میراجی کی مبہم شاعری۔

فن شناس نگاہیں عش عش کر اٹھیں — دولہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا گیا۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن ہی کے ہاں رہتا ہے۔

اس کی ہونے والی دلہن وہی گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دوسری لپ اسٹکوں کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع میں چند مہینے تک اس کے شوہر کو اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی، لیکن جب اجنتا اسٹوڈیو بند ہو گیا اور اس کے مالک کی کہیں۔۔۔ بھی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔

اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔

یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لئے تلخی کا موجب ہوئی لیکن بعد میں ایک عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سہیلی نے جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ کا چکر لگا آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی، اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہر کے پودوں کے درمیان اس انداز سے اوپر تلے رکھے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئی تھی۔ اس پر شہد کی مکھیاں میٹھی رس چوس رہی تھیں۔

اس کی دوسری سہیلی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں بیہوشی نئی تھی یا وہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا۔ جہاں اس کا ہوٹل اس کی لیڈی اسٹینوگرافر کا سر سہلاتا تھا۔

اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔

اب اس کو ڈرائیونگ آ گئی تھی مگر بہت بیمار ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے بچے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔

اس کی بھابی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہٹی کٹی ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جبکہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کتاب کر رہے تھے، اس کی بھابی نمودار ہوئی وہ مجرد تھی — اس کے ہاتھ میں قلم تھا نہ برش۔ لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔

صبح کمرے میں سے جمے ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابی کے گلے میں لگا دیئے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی، مگر ناکام رہی۔ اس لئے کہ مقدار کم تھی — اس نے مقدار بڑھا دی۔ حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی — لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی اور اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھر آتی تھی۔ منہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔

صبح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کے جسم کا ذرہ ذرہ دھاڑیں مار مار کر

روتا رہا ہے۔ اس کے وہ سب بچے جو پیدا ہو سکتے تھے، ان قبروں میں جوان کے لئے بن سکتی تھیں، اس دودھ کے لئے جو ان کا ہو سکتا تھا بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ مگر اس کے دودھ کہاں تھے ——وہ تو جنگلی بلّے پی چکے تھے۔

وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ ذہین تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

بالکل کھوکھلی ہو گئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے ——وہ سمجھ گئی، چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتی، شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی —— رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔

سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لئے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا۔ موٹر گراج میں اور اس کی ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی، دوسری کاٹی جانے والی تھی۔

وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تلچھٹ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے مگر اس بدذائقہ سے تو اس کے بچے کے ہونٹ بھی تر نہ ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئیٹزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے نرس بہت اچھی ہے۔ ہسپتال سے نکلتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور، کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے، چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے کے باعث ہسپتال میں مر گئی۔

اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے، اس نے علیحدہ کر دیئے، ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لئے اس نے ایک آیا رکھ دی —— کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھتی تھی " چلے جاؤ۔ —جو کوئی بھی تم ہو، چلے

جاؤ — میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔"

سیلف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے جن سے اس کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر کن سری آواز میں فحش گانے گاتی تھی آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی اس لئے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے۔ مگر اس میں وہ زبردست حجاب محسوس کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ پئے اور خوب پئے، اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدد لے — مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر ستر پوش ہو گئی تھی۔

تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی — ایک عرصے سے اس کا پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی اور اپنے جسم پر نئے خدوخال بنانے شروع کئے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی۔ وہ اپنا سامنا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی۔ بن کھائے پئے، آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا — آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا — ایک آدمی چھرا ہاتھ میں لئے، منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ مڑی تو حملہ آور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کا رخ کیا کبھی ادھر کا — آخر جو رستہ ملا، اس میں سے بھاگ نکلا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ چیختی، پکارتی: "ٹھہرو — ٹھہرو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی — ٹھہرو!" مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور اندر چلی گئی — اچانک اس کی نظریں آئینے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا، وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ

کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس میں خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی — وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلوبند تھا جس کے بڑے بڑے پھُندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔

دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے — وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑے رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں — تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اُٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پُراسرار خاموشی میں غرق تھا۔

کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے اُلجھے ہوئے دھاگے کھول رہا تھا، ہاتھ میں کرپان لئے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لحات اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولھے تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور، کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اُٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سُرمئی غبار۔ ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔

ایشر سنگھ سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اُس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے، تھوڑے لرزاں تھے مگر اس کے قدوقامت اور خدوخال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کلونت کور جیسی عورت کے لئے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لحات جب اسی طرح خاموشی میں گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی: ''ایشر سیاں......''

ایشر سنگھ نے گردن اُٹھا کر کلونت کور کی طرف دیکھا مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

کلونت کور چلائی: ''ایشر سیاں ......'' لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اُٹھ کر اس کی جانب جاتے ہوئے بولی: ''کہاں رہے تم اتنے دن؟''

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری: ''مجھے معلوم نہیں''۔

کلونت کور بھنا گئی: ''یہ بھی کوئی ماں یا جواب ہے!''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔ کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ''جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا: ''کلونت!'' اس کی آواز میں درد تھا۔

کلونت کور ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔ ''ہاں جانی'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔ کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپہ مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا: ''یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے......''

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گئے۔ کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا: ''ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟''

''برے کی ماں کے گھر......'' ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے اُبھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا: ''قسم واہگورو کی، بڑی جاندار عورت ہو۔''

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا: ''تمہیں میری قسم، بتاؤ، کہاں رہے......؟ شہر گئے تھے؟''

ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جُوڑا بناتے ہوئے جواب دیا: ''نہیں۔''

کلونت کور چڑ گئی: ''نہیں تم ضرور شہر گئے تھے......اور تم نے بہت سارو پیہ لُوٹا ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

''وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے......''

کلونت کور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی لیکن فوراً ہی بھڑک اُٹھی: ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں ہوا کیا......؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لُوٹ کے لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اُٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئے......''

ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا: ''دیکھا کیسے رنگ پیلا پڑ گیا...... ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟''

''تیری جان کی قسم، کچھ بھی نہیں۔''

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔ کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: ''ایشر سیاں، کیا بات ہے۔ تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟''

ایشر سنگھ ایک دم اُٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اُس پر حملہ کیا ہے۔ کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا: ''جانی، میں وہی ہوں...... گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی......''

کلونت کور نے کوئی مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی: ''تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟''

''برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔''

''بتاؤ گے نہیں؟''

''کوئی بات ہو تو بتاؤں۔''

''مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔''

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیے۔ مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آ گئی ــــ دونوں ہنسنے لگے۔

ایشر سنگھ نے اپنی صدری اُتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا: ''آ جاؤ! ایک بازی تاش کی ہو جائے!''

کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں۔ ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا: ''چل دفان ہو......''

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولھے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی: "نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے......"

ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبا لیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اُتار کے پھینک دیا اور کہا: "لو، پھر ہو جائے تُرپ چال......"

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اُتارتے ہیں، اُسی طرح اس کو اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اُس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا: "کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو......"

کلونت کور اپنے بازو پر اُبھرتے ہوئے لال دھبّے کو دیکھنے لگی' "بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں؟"

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا: "ہونے دے آج ظلم؟" اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے —— کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا، کان کی لووں کو کاٹا، اُبھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، بھرے ہوئے کولھوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے، گالوں کے مُنہ بھر بھر کے بوسے لئے، چوس چوس کر اُس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا —— کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح اُبلنے لگی لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گُر اور جتنے داؤ اُسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا: "ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتّا پھینک!"

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلّا کر پلنگ سے نیچے اُتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اُتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا: "ایشر سیاں وہ کون حرامزادی ہے، جس کے پاس تُو اتنے دن رہ کر آیا ہے، اور

جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟''

ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے اُبلنے لگی: ''میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ چڈو...... کون ہے وہ الفتی...... کون ہے وہ چور پتا؟''

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: ''کوئی بھی نہیں کلونت! کوئی بھی نہیں......''

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا: ''ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی...... کھا واہگورو جی کی قسم......

کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی: ''قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں...... تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا...... لے اب کھا واہگورو جی کی قسم...... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں......؟''

ایشر سنگھ نے بڑے دُکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہوگئی۔ اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اُٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔ کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی: ''جانے دے اب کلونت، جانے دے......!''

اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اُڑ اُڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جُلی نگاہوں سے دیکھا: ''میری جان! تم نے بہت جلدی کی...... لیکن جو ہوا، ٹھیک ہے......''

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا: ''مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟''

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''اور میں...... اور میں...... بھینی یا چھ آمیوں کو قتل کر چکا ہوں...... اسی کرپان سے......''

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی: ''میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرامزادی؟'' ایشر سنگھ کی آنکھیں دُھندلا رہی تھیں۔ ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا: ''گالی نہ دے اُس بھڑوی کو......''

کلونت چلّائی: ''میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟''

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رُندھ گئی: ''بتاتا ہوں......'' یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مُسکرایا: انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے......''

کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی: ''ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر......''

ایشر سنگھ کی مُسکراہٹ اس کی بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی: ''مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں...... گلا چرا ہے ماں یا میرا...... اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا......''

اور جب وہ بات بتانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے: ''کلونت میری جان! میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا......؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے...... شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصّہ لیا...... گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے، وہ میں نے تمہیں دے دیے...... لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی......''

ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور بڑی بے رحمی سے پوچھا: ''کون سی بات؟''

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا: ''جس مکان پر...... میں نے دھاوا بولا تھا...... اس میں سات...... آدمی تھے...... چھ میں نے...... قتل کر دیے...... اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے...... چھوڑ اسے...... سُن...... ایک لڑکی تھی، بہت ہی سُندر...... اس کو اُٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا''

کلونت کور خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اُڑایا: ''کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سُندر تھی...... میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا، نہیں ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ......''

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا: ''ہوں......!''

''......اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا...... راستے میں...... کیا کہہ رہا تھا میں......؟ ہاں راستے میں...... نہر کی پٹڑی کے پاس تھوہر کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا...... پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں......'' یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا: ''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے: ''میں نے ...... میں نے پتّا پھینکا ...... لیکن ...... لیکن ......'' اس کی آواز ڈوب گئی۔

کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا: ''پھر کیا ہوا؟''

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی: ''وہ ...... وہ مَری ہوئی تھی ...... لاش تھی ...... بالکل ٹھنڈا گوشت ...... جانی، مجھے اپنا ہاتھ دے ......''

کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

جانکی

پونہ میں ریسوں کا موسم شروع ہونے والا تھا کہ پشاور سے عزیز نے لکھا کہ میں اپنی ایک جان پہچان کی عورت جانکی کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، اس کو یا تو پونہ میں یا بمبئی کی کسی فلم کمپنی میں ملازم کرادو۔ تمہاری واقفیت کافی ہے، امید ہے تمہیں زیادہ دقت نہیں ہو گی۔

وقت کا تو اتنا زیادہ سوال نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا ہی نہیں تھا۔ فلم کمپنیوں میں اکثر وہی آدمی عورتیں لے کر آتے ہیں جنہیں ان کی کمائی کھانی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں بہت گھبرایا لیکن پھر میں نے سوچا عزیز اتنا پرانا دوست ہے، جانے کس یقین کے ساتھ بھیجا ہے، اس کو مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر بھی ایک گونہ تسکین ہوئی کہ عورت کے لئے اگر وہ جوان ہو، ہر فلم کمپنی کے دروازے کھلے ہیں۔ اتنی تردّد کی بات ہی کیا ہے، میری مدد کے بغیر ہی اسے کسی نہ کسی فلم کمپنی میں جگہ مل جائے گی۔

خط ملنے کے چوتھے روز وہ پونہ پہنچ گئی۔ کتنا لمبا سفر طے کر کے آئی تھی، پشاور سے بمبئی اور بمبئی سے پونہ.......... پلیٹ فارم پر چونکہ اس کو مجھے پہچاننا تھا، اس لئے گاڑی آنے پر میں نے ایک سرے سے ڈبوں کے پاس سے گزرنا شروع کیا۔ مجھے زیادہ دور نہ چلنا پڑا کیونکہ سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے ایک متوسط قد کی عورت جس کے ہاتھ میں میری تصویر تھی اتری۔ میری طرف وہ پیٹھ کر کے کھڑی ہوگئی اور ایڑیاں اونچی کر کے مجھے ہجوم میں تلاش کرنے لگی۔ میں نے قریب جا کر کہا، جسے آپ ڈھونڈ رہی ہیں وہ غالباً میں ہی ہوں۔

وہ پلٹی: ''اوہ، آپ!۔'' ایک نظر میری تصویر کی طرف دیکھا اور بڑے بے تکلف انداز

میں کہا:

''سعادت صاحب! سفر بہت ہی لمبا تھا۔ بمبئی میں فرنٹیئر میل سے اتر کر اس گاڑی کے انتظار میں جو وقت کاٹنا پڑا۔ اس نے طبیعت صاف کر دی۔''

میں نے کہا: ''اسباب کہاں ہے آپ کا؟''

''لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ڈبے کے اندر داخل ہوئی۔ دو سوٹ کیس اور ایک بستر نکالا۔

میں نے قلی بلوایا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا: ''میں ہوٹل میں ٹھہروں گی۔''

میں نے اسٹیشن کے سامنے ہی اس کے لئے ایک کمرے کا بندوبست کر دیا۔ اسے غسل وسل کر کے کپڑے تبدیل کرنے تھے اور آرام کرنا تھا، اس لئے میں نے اسے اپنا ایڈریس دیا اور یہ کہہ کر کہ صبح دس بجے مجھ سے ملے، ہوٹل سے چل دیا۔

صبح ساڑھے دس بجے وہ پربھات نگر، جہاں میں ایک دوست کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا، آئی جگہ تلاش کرتے ہوئے اسے دیر ہو گئی تھی۔ میرا دوست اس چھوٹے سے فلیٹ میں، جو نیا نیا تھا موجود نہیں تھا۔ میں رات دیر تک لکھنے کا کام کرنے کے باعث صبح دیر سے جاگا تھا، اس لئے ساڑھے دس بجے نہا دھو کر چائے پی رہا تھا، کہ وہ اچانک اندر داخل ہوئی۔

پلیٹ فارم پر اور ہوٹل میں تھکاوٹ کے باوجود وہ جاندار عورت تھی مگر جونہی وہ اس کمرے میں جہاں میں صرف بنیان اور پاجامہ پہنے چائے پی رہا تھا داخل ہوئی تو اس کی طرف دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت ہی پریشان اور خستہ حال عورت مجھ سے ملنے آئی ہے۔

جب میں نے اسے پلیٹ فارم پر دیکھا تھا تو وہ زندگی سے بھرپور تھی لیکن جب پربھات نگر کے نمبر گیارہ فلیٹ میں آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یا تو اس نے خیرات میں اپنا دس پندرہ اونس خون دے دیا ہے یا اس کا اسقاط ہو گیا ہے۔

جیسا کہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں، گھر میں اور کوئی موجود نہیں تھا، سوائے ایک بے وقوف نوکر کے۔ میرے دوست کا گھر جس میں ایک فلمی کہانی لکھنے کے لئے میں ٹھہرا ہوا تھا، بالکل سنسان تھا اور مجید ایک ایسا نوکر تھا جس کی موجودگی ویرانی میں اضافہ کرتی تھی۔

میں نے چائے کی ایک پیالی بنا کر جانکی کو دی اور کہا: ''ہوٹل سے تو آپ ناشتہ کر کے آئی ہوں گی، پھر بھی شوق فرمائیے!''

اس نے اضطراب سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے چائے کی پیالی اٹھائی اور پینا شروع

کی اس کی داہنی ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے مجھے معلوم
ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن ہچکچاتی ہے۔میں نے سوچا شاید ہوٹل میں رات کو کسی مسافر
نے اسے چھیڑا ہے چنانچہ میں نے کہا:"آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہوٹل میں؟"

"جی، جی نہیں!"

میں یہ مختصر جواب سن کر خاموش رہا۔چائے ختم ہوئی تو میں نے سوچا اب کوئی بات کرنی
چاہیے۔چنانچہ میں نے پوچھا:"عزیز صاحب کیسے ہیں؟"

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔چائے کی پیالی تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی
اور لفظوں کو جلدی جلدی ادا کر کے کہا:"منٹو صاحب آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا:"پونہ میں تو میں کسی کو نہیں جانتا۔"

"اوہ!"

میں نے پوچھا:"کیوں بیمار ہیں آپ؟"

"جی ہاں:" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے دریافت کیا:"کیا تکلیف ہے؟"

اس کے تیکھے ہونٹ جو مسکراتے وقت سکڑ جاتے تھے یا سکیڑ لئے جاتے تھے وا ہوئے۔
اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔پھر میرا سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا اور ایک سگریٹ
سلگا کر کہا:"معاف کیجئے گا میں سگریٹ پیا کرتی ہوں۔"

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صرف سگریٹ پیا ہی نہیں کرتی بلکہ پھونکا کرتی تھی۔بالکل
مردوں کی طرح سگریٹ انگلیوں میں دبا کر وہ زور زور سے کش لیتی اور ایک دن میں تقریباً پچھتر
سگریٹوں کا دھواں کھینچتی تھی۔

میں نے کہا:"آپ بتاتی کیوں نہیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟"

اس نے کنواری لڑکیوں کی طرح جھنجھلا کر اپنا ایک پاؤں فرش پر مارا۔

"ہائے اللہ! میں کیسے بتاؤں آپ کو" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔مسکراتے ہوئے تیکھے ہونٹوں
کی محراب میں سے مجھے اس کے دانت نظر آئے جو غیر معمولی طور پر صاف اور چمکیلے تھے۔وہ بیٹھ گئی
اور میری آنکھوں میں اپنی ڈگمگاتی آنکھوں کو نہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا:"بات یہ
ہے کہ پندرہ بیس دن اوپر ہو گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ............"

پہلے تو میں مطلب نہ سمجھا لیکن جب وہ بولتے بولتے رک گئی تو میں کسی قدر سمجھ گیا" ایسا

اکثر ہوتا ہے۔"

اس نے زور سے کش لیا اور مردوں کی طرح زور سے دُھویں کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کچھ ٹھہر نہ گیا ہو۔"

میں نے کہا: "اوہ!"

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اس کی گردن چائے کی طشتری میں دبائی: "اگر ایسا ہو گیا ہے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ ایک دفعہ پشاور میں ایسی ہی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ لیکن عزیز صاحب اپنے ایک حکیم دوست سے ایسی دوا لائے تھے جس سے چند دن ہی میں سب صاف ہو گیا تھا۔

میں نے پوچھا: "آپ کو بچے پسند نہیں؟"

وہ مسکرائی "پسند ہیں.......... لیکن کون پالتا پھرے۔"

میں نے کہا: "آپ کو معلوم ہے اس طرح بچے ضائع کرنا جرم ہے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی.......... پھر اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا: "مجھ سے عزیز صاحب نے بھی یہی کہا تھا۔ لیکن سعادت صاحب میں پوچھتی ہوں اس میں جرم کی کونسی بات ہے۔ اپنی ہی تو چیز ہے اور ان قانون بنانے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ بچہ ضائع کراتے ہوئے تکلیف کتنی ہوتی ہے۔

بڑا جرم ہے!"

میں بے اختیار ہنس پڑا: "عجیب و غریب عورت ہو تم جانکی!"

جانکی نے بھی ہنسنا شروع کیا: "عزیز صاحب بھی یہی کہا کرتے ہیں۔"

ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا مشاہدہ ہے جو آدمی پُرخلوص ہوں۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر رومال نکالا اور آنکھیں خشک کر کے بھولے بچوں کے انداز میں پوچھا: "سعادت صاحب! بتائیے، کیا میری باتیں دلچسپ ہوتی ہیں؟"

میں نے کہا "بہت"۔

"جھوٹ!"

"اس کا ثبوت؟"

اس نے سگریٹ سلگانا شروع کر دیا: "بھئی، شاید ایسا ہو۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کچھ کچھ بے وقوف ہوں۔ زیادہ کھاتی ہوں، زیادہ بولتی ہوں، زیادہ ہنستی ہوں۔ اب آپ ہی دیکھئے نا

زیادہ کھانے سے میرا پیٹ کتنا بڑھ گیا ہے۔ عزیز صاحب ہمیشہ کہتے رہے جانکی کم کھایا کرو پر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ سعادت صاحب بات یہ ہے کہ میں کم کھاؤں تو ہر وقت ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے کوئی بات کہنا بھول گئی ہوں۔"

اس نے پھر ہنسنا شروع کیا۔ میں بھی اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔

اس کی ہنسی بالکل الگ قسم کی تھی۔ بیچ بیچ میں گھنگھرو سے بجتے تھے۔

پھر وہ اسقاط حمل کے متعلق باتیں کرنے ہی والی تھی کہ میرا دوست، جس کے یہاں میں ٹھہرا ہوا تھا آ گیا۔ میں نے جانکی سے اس کا تعارف کرایا اور بتایا کہ وہ فلم لائن میں آنے کا شوق رکھتی ہے۔ میرا دوست اسے اسٹوڈیو لے گیا کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ ڈائریکٹر جس کے ساتھ وہ بحیثیت اسسٹنٹ کے کام کر رہا تھا، اپنے نئے فلم میں جانکی کو ایک خاص رول کے لئے ضرور لے گا۔

پونہ میں جتنے اسٹوڈیو تھے، میں نے مختلف ذرائع سے جانکی کے لئے کوشش کی کسی نے اس کا ساؤنڈ ٹسٹ لیا۔ کسی نے کیمرہ ٹسٹ۔ ایک فلم کمپنی میں اس کو مختلف قسم کے لباس پہنا کر دیکھا گیا مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک تو جانکی ویسے ہی دن اوپر ہو جانے کے باعث پریشان تھی، چار پانچ روز متواتر جب اسے مختلف فلم کمپنیوں کے اکتا دینے والے ماحول میں بے نتیجہ گزارنے پڑے تو وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

بچہ ضائع کرنے کے لئے وہ ہر روز بیس بیس گرین کونین کھاتی تھی۔ اس سے بھی اس کی طبیعت پر گرانی سی رہتی تھی۔ عزیز صاحب کے دن پشاور میں اس کے بغیر کیسے گزرتے ہیں، اس کے متعلق بھی اس کو ہر وقت فکر رہتی تھی۔ پونہ پہنچتے ہی اس نے ایک تار بھیجا تھا۔ اس کے بعد وہ بلا ناغہ ہر روز ایک خط لکھ رہی تھی۔ ہر خط میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور دوا باقاعدگی کے ساتھ پیتے رہیں۔

عزیز صاحب کو کیا بیماری تھی، اس کا مجھے علم نہیں لیکن جانکی سے مجھے اتنا معلوم ہوا کہ عزیز صاحب کو چونکہ اس سے محبت ہے، اس لئے وہ فوراً اس کا کہنا مان لیتے ہیں گھر میں کئی بار بیوی سے اس کا جھگڑا ہوا کہ وہ دوا نہیں پیتے لیکن جانکی سے اس معاملے میں انہوں نے کبھی چوں بھی نہ کی۔

شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ جانکی عزیز کے متعلق جو اتنی فکر مند رہتی ہے، محض بکواس ہے، بناوٹ ہے لیکن آہستہ آہستہ میں نے اس کی بے تکلف باتوں سے محسوس کیا کہ اسے حقیقتاً عزیز کا خیال ہے۔ اس کا جب بھی خط آیا جانکی پڑھ کر ضرور روئی۔

فلم کمپنیوں کے طواف کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لیکن ایک روز جانکی کو یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا اندیشہ غلط تھا۔ دن واقعی اوپر ہو گئے تھے لیکن وہ بات جس کا اسے کھٹکا تھا، نہیں تھی۔

جانکی کو پونہ آئے بیس روز ہو چلے تھے۔ عزیز کو وہ خط پر خط لکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے بھی لمبے لمبے محبت نامے آتے تھے ایک خط میں عزیز نے مجھ سے کہا تھا کہ پونہ میں اگر جانکی کے لئے کچھ نہیں ہوتا تو میں بمبئی میں کوشش کروں کیونکہ وہاں بے شمار اسٹوڈیو ہیں۔ بات معقول تھی لیکن میں سیریو لکھنے میں مصروف تھا، اس لئے جانکی کے ساتھ بمبئی جانا مشکل تھا، لیکن میں نے پونہ سے اپنے دوست سعید کو جو ایک فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کر رہا تھا، ٹیلی فون کیا اِتفاق سے وہ اس وقت اسٹوڈیو میں موجود نہ تھا۔ آفس میں نرائن کھڑا تھا اسے جب معلوم ہوا کہ میں پونہ سے بول رہا ہوں تو ٹیلی فون لے لیا اور زور سے چلّایا: ''ہلو، منٹو.........نرائن اسپیکنگ فرام دس انڈ.........کہو، بات کیا ہے۔ سعید اس وقت اسٹوڈیو میں نہیں ہے۔ گھر میں بیٹھا رضیہ سے آخری حساب کتاب کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا'' کیا مطلب؟''

نرائن نے ادھر سے جواب دیا، کھٹ پٹ ہو گئی ہے ان میں۔ رضیہ نے ایک اور آدمی سے ٹانکا ملا لیا ہے۔

میں نے کہا: ''لیکن یہ حساب کتاب کیسا ہو رہا ہے؟''

نرائن بولا: ''بڑا کمینہ ہے یار، سعید — اس سے کپڑے لے رہا ہے جو اس نے خرید کر دیئے تھے''۔ ''بات یہ ہے کہ پشاور سے میرے ایک عزیز نے ایک عورت یہاں بھیجی ہے جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔''

جانکی میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے مناسب وموزوں لفظوں میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا۔

میں تصحیح کرنے ہی والا تھا کہ نرائن کی بلند آواز کانوں کے اندر گھسی: ''عورت! پشاور کی عورت خو، بیجو اس کو جلدی۔ خو ہم بھی قصور کا پٹھان ہے۔ میں نے کہا'' بکواس نہ کرو نرائن سنو، کل دکن کوئن سے میں انہیں بمبئی بھیج رہا ہوں۔ سعید یا تم کوئی بھی اسے اسٹیشن پر لینے کے لئے آجانا، کل دکن کوئن سے۔ یاد رہے۔

نرائن کی آواز آئی: ''پر ہم اسے پہچانیں گے کیسے؟''

میں نے جواب دیا'' وہ خود تمہیں پہچان لے گی — لیکن دیکھو کوشش کر کے اسے کسی نہ کسی جگہ ضرور رکھوا دینا۔''

تین منٹ گذر گئے۔ میں نے جانکی سے کہا۔ ''کل دکن کوئن سے تم بمبئی چلی جانا۔ سعید اور نرائن دونوں کی تصویریں دکھاتا ہوں۔ لمبے تڑنگے خوبصورت جوان ہیں۔ تمہیں پہچاننے میں دِقت نہیں ہوگی''۔

میں نے البم میں جانکی کو سعید اور نرائن کی مختلف فوٹو دکھائے۔ دیر تک وہ انہیں دیکھتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ سعید کا فوٹو اس نے زیادہ غور سے دیکھا۔ البم ایک طرف رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالنے کی ڈگمگاتی کوشش کرتے ہوئے، اس نے مجھ سے پوچھا ''دونوں کیسے آدمی ہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ دونوں کیسے آدمی ہیں — میں نے سنا ہے کہ فلموں میں اکثر آدمی بُرے ہوتے ہیں۔''

اس کے لہجے میں ایک ٹوہ لینے والی سنجیدگی تھی۔

میں نے کہا: ''یہ تو درست ہے لیکن فلموں میں نیک آدمیوں کی ضرورت ہی کہاں ہوتی ہے!''

''کیوں؟''

''دنیا میں دو قسم کے انسان ہیں۔ ایک قسم ان انسانوں کی ہے جو اپنے زخموں سے درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان کی ہے جو دوسروں کے زخم دیکھ کر درد کا اندازہ کرتے ہیں۔ تمہارا خیال کیا ہے، کون سی قسم کے انسان زخم کے درد اور اس کی تہہ کی جلن کو صحیح طور پر محسوس کرتے ہیں۔''

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: ''وہ جن کے زخم لگے ہوتے ہیں'' میں نے کہا ''بالکل درست۔ فلموں میں اصل کی اچھی نقل وہی اتار سکتا ہے جسے اصل کی واقفیت ہو۔ ناکام محبت میں دل کیسے ٹوٹتا ہے، یہ ناکام محبت ہی اچھی طرح بتا سکتا ہے۔ وہ عورت جو پانچ وقت جانماز بچھا کر نماز پڑھتی ہے اور عشق و محبت کو سُور کے برابر سمجھتی ہے، کیمرے کے سامنے کسی مرد کے ساتھ اظہار محبت کیا خاک کرے گی!''

اس نے پھر سوچا: ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ فلم لائن میں داخل ہونے سے پہلے عورت کو سب چیزیں جاننی چاہئیں۔''

میں نے کہا: ''یہ ضروری نہیں۔ فلم لائن میں آکر بھی وہ چیزیں جان سکتی ہے اس نے میری بات پر غور نہ کیا اور جو پہلا سوال کیا تھا پھر اسے دہرایا:

''سعید صاحب اور نرائن صاحب کیسے آدمی ہیں؟
''تم تفصیل سے پوچھنا چاہتی ہو؟''
''تفصیل سے آپ کا کیا مطلب؟''
''یہ کہ دونوں میں سے آپ کے لئے کون بہتر رہے گا!''
جانکی کو میری یہ بات ناگوار گزری:
''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟''
''جیسی تم چاہتی ہو''۔
''ہٹایئے بھی۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرائی ''میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا: ''جب پوچھو گی تو میں نرائن کی سفارش کروں گا۔''
''کیوں؟''
''اس لئے کہ وہ سعید کے مقابلے میں بہتر انسان ہے۔''
میرا اب بھی یہی خیال ہے۔ سعید شاعر ہے، ایک بہت بے رحم قسم کا شاعر۔ مرغی پکڑے گا تو ذبح کرنے کی بجائے اس کی گردن مروڑے گا۔ گردن مروڑ کر اس کے پر نوچے گا۔ پر نوچنے کے بعد اس کی یخنی نکالے گا۔ یخنی پی کر اور ہڈیاں چبا کر وہ بڑے آرام اور سکون سے ایک کونے میں بیٹھ کر اس مرغی کی موت پر ایک نظم لکھے گا جو اس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوگی۔
شراب پئے گا تو کبھی بہکے گا نہیں۔ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ شراب کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ صبح بہت آہستہ آہستہ بستر پر سے اٹھے گا۔ نوکر چائے کی پیالی بنا کر لائے گا۔ اگر رات کی بچی ہوئی رم سرہانے پڑی ہے تو اسے چائے میں انڈیل لے گا اور اس مکسچر کو ایک ایک گھونٹ کر کے ایسے پئے گا جیسے اس میں ذائقے کی کوئی حس ہی نہیں۔
بدن پر کوئی پھوڑا نکلا ہے۔ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے، مگر مجال ہے جو وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔ پیپ نکل رہی ہے، گل سڑ گیا ہے، ناسور بننے کا خطرہ ہے، لیکن سعید کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جائے گا۔ آپ اس سے کچھ کہیں گے تو یہ جواب ملے گا۔ ''اکثر اوقات بیماریاں انسان کی جزو بدن ہو جاتی ہیں جب مجھے یہ زخم تکلیف نہیں دیتا تو علاج کی کیا ضرورت ہے''۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ زخم کی طرف اس طرح دیکھے گا جیسے کوئی اچھا شعر نظر آ گیا ہے۔
ایکٹنگ وہ ساری عمر نہیں کر سکے گا، اس لئے کہ وہ لطیف جذبات سے قریب عاری ہے۔ میں نے اسے ایک فلم میں دیکھا جو ہیروئن کے گانوں کے باعث بہت مقبول ہوا تھا

ایک جگہ اس نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت کا اظہار کرنا تھا۔ خدا کی قسم اس نے ہیروئن کا ہاتھ کچھ اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا جیسے کُتّے کا پنجہ پکڑا جاتا ہے۔ میں اس سے کئی بار کہہ چکا ہوں ایکٹر بننے کا خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اچھے شاعر ہو، گھر بیٹھو اور نظمیں لکھا کرو۔ مگر اس کے دماغ پر ابھی تک ایکٹنگ کی دھن سوار ہے۔

نرائن مجھے بہت پسند ہے۔ اسٹوڈیو کی زندگی کے جو اصول اس نے اپنے لئے وضع کر رکھے ہیں، مجھے اچھے لگتے ہیں۔

۱............ایکٹر جب تک ایکٹر ہے، اسے شادی نہیں کرنی چاہیئے۔ شادی کرلے تو فوراً فلم کو طلاق دے کر دودھ دہی کی دکان کھول لے۔ اگر مشہور ایکٹر رہا ہے تو کافی آمدنی ہو جایا کرے گی۔

۲............کوئی ایکٹرس تمہیں بھیّا یا بھائی صاحب کہے تو فوراً اس کے کان میں کہو، آپ کی انگیا کا سائز کیا ہے۔

۳............کسی ایکٹرس پر اگر تمہاری طبیعت آگئی ہے تو تمہیدیں باندھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اس سے تخلیئے میں ملو اور کہو کہ میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں، اس کا یقین نہ آئے تو پوری جیب باہر نکال کر دکھا دو۔

۴............اگر کوئی ایکٹرس تمہارے حصّے میں آجائے تو اس کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی نہ لو۔ ایکٹرسوں کے شوہروں اور بھائیوں کے لئے یہ پیسہ حلال ہے۔

۵............اس بات کا خیال رکھنا کہ ایکٹرس کے بطن سے تمہاری کوئی اولاد نہ ہو۔ سوراج ملنے کے بعد البتہ تم اس کی اولاد پیدا کر سکتے ہو۔

۶............یاد رکھو کہ ایکٹر کی بھی عاقبت ہوتی ہے۔ اسے ریزر اور کنگھی سے سنوارنے کے بجائے کبھی کبھی غیر مہذب طریقے سے بھی سنوارنے کی کوشش کیا کرو، مثال کے طور پر کوئی نیک کام کر کے۔

۷............اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ احترام پٹھان چوکیدار کا کرو۔ صبح اسٹوڈیو میں آتے وقت اسے سلام کرنے سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ یہاں نہیں تو دوسری دنیا میں، جہاں فلم کمپنیاں نہیں ہوں گی۔

۸............شراب اور ایکٹرس کی عادت ہرگز نہ ڈالو۔ بہت ممکن ہے کسی روز کانگریس گورنمنٹ لہر میں آکر یہ دونوں چیزیں ممنوع قرار دے دے۔

۹..........سوداگر، مسلمان سوداگر ہوسکتا ہے۔ لیکن ایکٹر ہندو ایکٹر، یا مسلم ایکٹر نہیں ہوسکتا۔

۱۰..........جھوٹ نہ بولو۔

یہ سب باتیں ''نرائن کے دس احکام'' کے عنوان تلے اس نے اپنی ایک نوٹ بک میں لکھ رکھی ہیں جن سے اس کے کیریکٹر، کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ان سب پر عمل نہیں کرتا۔ مگر یہ حقیقت نہیں۔ سعید اور نرائن کے متعلق جو میرے خیالات تھے میں نے جانکی کے پوچھے بغیر اشارۃً بتا دیئے اور آخر میں اس سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر تم اس لائن میں آگئیں تو کسی نہ کسی مرد کا سہارا تمہیں لینا پڑے گا۔ نرائن کے متعلق میرا خیال ہے کہ اچھا دوست ثابت ہوگا۔

میرا مشورہ اس نے سن لیا اور بمبئی چلی گئی۔ دوسرے روز خوش خوش واپس آئی کیونکہ نرائن نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک سال کے لئے پانچ سو روپے ماہوار پر اسے ملازم کرادیا تھا۔ یہ ملازمت اسے کیسے ملی، دیر تک اس کے متعلق باتیں ہوئی۔ جب اور کچھ سننے کو نہ رہا تو میں نے اس سے پوچھا: ''سعید اور نرائن، دونوں سے تمہاری ملاقات ہوئی، ان میں سے کس نے تم کو زیادہ پسند کیا؟''

جانکی کے ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لغزش بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا: ''سعید صاحب!'' یہ کہہ کر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''سعادت صاحب آپ نے کیوں اتنے پل باندھے تھے۔ نرائن کی تعریفوں کے؟''

میں نے پوچھا: ''کیوں''

''بڑا ہی واہیات آدمی ہے۔ شام کو باہر کرسیاں بچھا کر سعید صاحب اور وہ شراب پینے کے لئے بیٹھے تو باتوں باتوں میں میں نے نرائن بھیا کہا۔ اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر پوچھا: ''تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے۔''

''بھگوان جانتا ہے میرے تن بدن میں تو آگ ہی لگ گئی۔ کیسا لچر آدمی ہے'' جانکی کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

اس نے تیزی سے کہا: ''آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟''

''اس کی بے وقوفی پر۔'' یہ کہہ کر میں نے ہنسنا بند کردیا۔

تھوڑی دیر نرائن کو برا بھلا کہنے کے بعد جانکی نے عزیز کے متعلق فکر مند لہجے میں باتیں

تروع کردیں۔ کئی دنوں سے اس کا خط نہیں آیا تھا، اس لئے طرح طرح کے خیال اسے ستا رہے تھے۔ کہیں انہیں پھر زکام نہ ہو گیا ہو۔ اندھا دھند سائیکل چلاتے ہیں، کہیں حادثہ ہی نہ ہو گیا ہو۔ پونہ ہی نہ آ رہے ہوں، کیونکہ جانکی کو رخصت کرتے وقت انہوں نے کہا تھا ایک روز میں چپ چاپ تمہارے پاس چلا آؤں گا۔

باتیں کرنے کے بعد جب اس کا تر دّد کم ہوا تو اس نے عزیز کی تعریفیں شروع کر دیں۔ گھر میں بچوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ہر روز صبح ان کو ورزش کراتے ہیں اور نہلا دھلا کر اسکول چھوڑنے جاتے ہیں۔ بیوی بالکل پھوہڑ ہے، اس لئے رشتہ داروں سے سارا رکھ رکھاؤ خود انہی کو کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ جانکی کو ٹائی فائڈ ہو گیا تھا تو بیس دن تک متواتر نرسوں کی طرح اس کی تیمارداری کرتے رہے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے روز مناسب و موزوں الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ بمبئی چلی گئی جہاں اس کے لئے ایک نئی اور چمکیلی دنیا کے دروازے کھل گئے تھے۔

پونہ میں مجھے تقریباً دو مہینے کہانی کا منظر نامہ تیار کرنے میں لگے۔ حق الخدمت وصول کر کے میں نے بمبئی کا رخ کیا جہاں مجھے ایک نیا کنٹریکٹ مل رہا تھا۔ میں صبح پانچ بجے کے قریب اندھیری پہنچا جہاں ایک معمولی بنگلے میں سعید اور نرائن، دونوں اکٹھے رہتے تھے۔ برآمدے میں داخل ہوا تو دروازہ بند پایا۔ میں نے سوچا سو رہے ہوں گے، تکلیف نہیں دینا چاہئے۔ پچھلی طرف ایک دروازہ ہے۔ جو نوکروں کے لئے اکثر کھلا رہتا ہے، میں اس میں سے اندر داخل ہوا۔ باورچی خانہ اور ساتھ والا کمرہ جس میں کھانا کھایا جاتا ہے، حسب معمول بے حد غلیظ تھے۔ سامنے والا کمرہ مہمانوں کے لئے مخصوص تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر سعید اور اس کے ساتھ کوئی اور لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔

مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ دوسرے پلنگ پر میں کپڑے اتارے بغیر لیٹ گیا پائنتی پر کمبل پڑا تھا، یہ میں نے ٹانگوں پر ڈال لیا۔ سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سعید کے پیچھے سے ایک چوڑیوں والا ہاتھ نکلا اور پلنگ کے پاس رکھی ہوئی کرسی کی طرف بڑھنے لگا۔ کرسی پر لٹھے کی سفید شلوار لٹک رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سعید کے ساتھ جانکی لیٹی تھی۔ میں نے کرسی پر سے شلوار اٹھائی اور اس کی طرف پھینک دی۔ نرائن کے کمرے میں جا کر میں نے اسے جگایا۔ رات کے دو بجے اس کی شوٹنگ ختم ہوئی تھی، مجھے افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اس غریب کو جگایا لیکن وہ مجھ سے

باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کسی خاص موضوع پر نہیں۔ مجھے اچانک دیکھ کر بقول اس کے وہ کچھ بے ہودہ بکواس کرنا چاہتا تھا؛ چنانچہ صبح نو بجے تک ہم بے ہودہ بکواس میں مشغول رہے جس میں بار بار جانکی کا بھی ذکر آیا۔

جب میں نے انگیا والی بات چھیڑی تو نرائن بہت ہنسا۔ ہنستے ہنستے اس نے کہا سب سے مزے دار بات تو یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کان کے ساتھ منہ لگا کر پوچھا تمہاری انگیا کا سائز کیا ہے تو اس نے بتا دیا کہا: ''چوبیس''۔

اس کے بعد اچانک اسے میرے سوال کی بے ہودگی کا احساس ہوا۔ اور مجھے کوسنا شروع کر دیا۔ بالکل بچی ہے۔ جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو سینے پر دوپٹہ رکھ لیتی ہے۔ لیکن منٹو! بڑی وفادار عورت ہے۔

میں نے پوچھا: ''یہ تم نے کیسے جانا؟''

نرائن مسکرایا: ''عورت، جو ایک بالکل اجنبی آدمی کو اپنی انگیا کا صحیح سائز بتا دے، دھوکے باز ہرگز نہیں ہو سکتی۔''

عجیب و غریب منطق تھی۔ لیکن نرائن نے مجھے بڑی سنجیدگی سے یقین دلایا کہ جانکی بڑی پُرخلوص عورت ہے۔ اس نے کہا منٹو: ''تمہیں معلوم نہیں سعید کی کتنی خدمت کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی خبر گیری جو پرلے درجے کا بے پرواہ ہو آسان کام نہیں۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ جانکی اس مشکل کو بڑی آسانی سے نبھا رہی ہے۔ عورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پُرخلوص اور ایماندار آیا بھی ہے۔ صبح اٹھ کر اس خرذات کو جگانے میں آدھ گھنٹہ صرف کرتی ہے۔ اس کے دانت صاف کراتی ہے، کپڑے پہناتی ہے، ناشتہ کراتی ہے۔ اور رات کو جب وہ رم پی کر بستر پر لیٹتا ہے سب دروازے بند کر کے اس کے ساتھ لیٹ جاتی ہے۔ اور جب اسٹوڈیو میں کسی سے ملتی ہے تو صرف سعید کی باتیں کرتی ہے۔ سعید صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ سعید صاحب بہت اچھا گاتے ہیں۔ سعید صاحب کا وزن بڑھ گیا ہے۔ سعید صاحب کا پل اوور تیار ہو گیا ہے۔ سعید صاحب کے لئے پشاور سے پوٹھوہاری سینڈل منگوائی ہے۔

سعید صاحب کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہے۔ اسپرو لینے جا رہی ہوں۔ سعید صاحب نے آج مجھ پر ایک شعر کہا۔ اور جب مجھ سے مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انگیا والی بات یاد کر کے تیوری چڑھا لیتی ہے۔''

میں تقریباً دس دن سعید اور نرائن کا مہمان رہا۔ اس دوران میں سعید نے جانکی کے

متعلق مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ ان کا معاملہ کافی پرانا ہو چکا ہے۔ جانکی سے البتہ کافی باتیں ہوئی۔ وہ سعید سے بہت خوش تھی لیکن اسے اس کی بے پرواہ طبعت کا بہت گلہ تھا۔

''سعادت صاحب! اپنی صحت کا بالکل خیال ہی نہیں رکھتے۔ بہت بے پرواہ ہیں۔ ہر وقت سوچنا، جو ہوا اس لئے کسی بات کا خیال ہی نہیں رہتا۔ آپ ہنسنے لگے، لیکن مجھے ہر روز ان سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آپ سنڈاس گئے تھے یا نہیں۔''

نرائن نے مجھ سے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک نکلا۔ جانکی ہر وقت سعید کی خبر گیری میں منہمک رہتی تھی۔ میں دس دن اندھیری کے بنگلے میں رہا۔ ان دس دنوں میں جانکی کی بے لوث خدمت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار آتا رہا کہ عزیز کو کیا ہوا۔ جانکی کو اس کا بھی تو بہت خیال رہتا ہے۔ کیا سعید کو پا کر وہ اس کو بھول چکی تھی۔

میں نے اس سوال کا جواب جانکی ہی سے پوچھ لیا ہوتا اگر میں کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا۔ جس کمپنی سے میرا کنٹریکٹ ہونے والا تھا، اس کے مالک سے میری کسی بات پر چخ ہو گئی اور میں دماغی تکدّر دور کرنے کے لئے پونہ چلا گیا۔ دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ بمبئی سے عزیز کا تار آیا کہ میں آ رہا ہوں۔

پانچ چھ گھنٹے کے بعد وہ میرے پاس تھا۔ اور دوسرے روز صبح سویرے جانکی میرے کمرے پر دستک دے رہی تھی۔

عزیز اور جانکی جب ایک دوسرے سے ملے تو انہوں نے دیر سے بچھڑے ہوئے عاشق معشوق کی سرگرمی ظاہر نہ کی۔ میرے اور عزیز کے تعلقات شروع سے بہت سنجیدہ اور متین رہے ہیں، شاید اسی وجہ سے وہ دونوں معتدل رہے۔

عزیز کا خیال تھا ہوٹل میں اٹھ جائے لیکن میرا دوست جس کے یہاں میں ٹھہرا تھا آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے کولہاپور گیا تھا، اس لئے میں نے عزیز اور جانکی کو اپنے پاس ہی رکھا۔ تین کمرے تھے ایک میں جانکی سو سکتی تھی دوسرے میں عزیز۔ یوں تو مجھے ان دونوں کو ایک ہی کمرہ دینا چاہیئے تھا لیکن عزیز سے میری اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جانکی سے اپنے تعلق کو مجھ پر ظاہر بھی نہیں کیا تھا۔

رات کو دونوں سنیما دیکھنے چلے گئے۔ میں ساتھ نہ گیا، اس لئے کہ میں فلم کے لئے ایک نئی کہانی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دو بجے تک میں جاگتا رہا۔ اس کے بعد سو گیا۔ ایک چابی میں نے عزیز کو دے دی تھی اس لئے مجھے ان کی طرف سے اطمینان تھا۔

رات کو میں چاہے بہت دیر تک کام کروں، ساڑھے تین اور چار بجے کے درمیان ایک دفعہ ضرور جاگتا ہوں اور اٹھ کر پانی پیتا ہوں۔ حسبِ عادت اس رات کو بھی میں پانی پینے کے لئے اٹھا۔ اتفاق سے جو کمرہ میرا تھا، یعنی جس میں میں نے اپنا بستر جمایا ہوا تھا، عزیز کے پاس تھا، اور اس میں میری صراحی پڑی تھی۔

اگر مجھے شدت کی پیاس نہ لگی ہوتی تو عزیز کو تکلیف نہ دیتا لیکن زیادہ وسکی پینے کے باعث میرا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا، اس لئے مجھے دستک دینی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ جانکی نے آنکھیں ملتے ملتے دروازہ کھولا اور کہا "سعید صاحب!" اور جب مجھے دیکھا تو ایک ہلکی سی "اوہ" اس کے منہ سے نکل گئی۔

اندر کے پلنگ پر عزیز سو رہا تھا۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ جانکی بھی مسکرائی اور اس کے تیکھے ہونٹ ایک کونے کی طرف سکڑ گئے۔ میں نے پانی کی صراحی لی اور چلا آیا۔

صبح اٹھا تو کمرے میں دھواں جمع تھا۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو جانکی کاغذ جلا جلا کر عزیز کے غسل کے لئے پانی گرم کر رہی تھی۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور انگیٹھی میں پھونکیں مارتی ہوئی کہنے لگی: "عزیز صاحب ٹھنڈے پانی سے نہائیں تو انہیں زکام ہو جاتا ہے۔ میں نہیں تھی پشاور میں تو ایک مہینہ بیمار رہے، اور رہتے بھی کیوں نہیں جب دوا پینی ہی چھوڑ دی تھی .... آپ نے دیکھا نہیں کتنے دبلے ہو گئے ہیں۔"

اور عزیز نہا دھو کر جب کسی کام کی غرض سے باہر گیا تو جانکی نے مجھ سے سعید کے نام تار لکھنے کے لئے کہا: "مجھے کل یہاں پہنچتے ہی انہیں تار بھیجنا چاہئے تھا۔ کتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ انہیں بہت تشویش ہو رہی ہوگی۔"

اس نے مجھ سے تار کا مضمون بنوایا جس میں اپنی بخیریت پہنچنے کی اطلاع تو تھی لیکن سعید کی خیریت دریافت کرنے کا اضطراب زیادہ تھا۔ انجکشن لگوانے کی تاکید بھی تھی۔

چار روز گزر گئے۔ سعید کو جانکی نے پانچ تار روانہ کئے پر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ بمبئی جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اچانک شام کو عزیز کی طبیعت خراب ہو گئی۔ مجھ سے سعید کے نام ایک اور تار لکھوا کر وہ ساری رات عزیز کی تیمارداری میں مصروف رہی۔ معمولی بخار تھا لیکن جانکی کو بے حد تشویش تھی۔ میرا خیال ہے اس تشویش میں سعید کی خاموشی کا پیدا کردہ وہ اضطراب بھی شامل تھا۔ وہ مجھ سے اس دوران میں کئی بار کہہ چکی تھی "سعادت صاحب میرا خیال ہے سعید صاحب ضرور بیمار ہیں ورنہ وہ مجھے میرے تاروں اور خطوط کا جواب ضرور لکھتے۔

پانچویں روز شام کو عزیز کی موجودگی میں سعید کا تار آیا جس میں لکھا تھا میں بہت بیمار ہوں فوراً چلی آؤ۔ تار آنے سے پہلے جانکی میری کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ لیکن جب اس نے سعید کی بیماری کی خبر سنی تو ایک دم خاموش ہو گئی۔ عزیز کو یہ خاموشی بہت ناگوار معلوم ہوئی کیونکہ جب اس نے جانکی کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ میں اٹھ کر چلا گیا۔

شام کو جب واپس آیا تو جانکی اور عزیز کچھ اس طرح علیحدہ علیحدہ بیٹھے تھے جیسے ان میں کافی جھگڑا ہو چکا تھا۔ جانکی کے گالوں پر آنسوؤں کا میل تھا جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جانکی نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عزیز سے کہا: ''میں جاتی ہوں، لیکن بہت جلد واپس آجاؤں گی۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''سعادت صاحب ان کا خیال رکھیے ابھی تک بخار دور نہیں ہوا۔''

میں اسٹیشن تک اس کے ساتھ گیا۔ بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ خرید کر اسے گاڑی پر بٹھایا اور گھر چلا آیا۔ عزیز کو ہلکا ہلکا بخار تھا۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے لیکن جانکی کا ذکر نہ آیا۔

تیسرے روز صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اس کے بعد جانکی کی۔ لفظوں کو اوپر تلے کرتی ہوئی وہ عزیز سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی طبیعت اب کیسی ہے اور کیا اس کی غیر موجودگی میں اس نے باقاعدہ دوا پی تھی یا نہیں۔ عزیز کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچی لیکن آدھ گھنٹے بعد جب کہ نیند سے میری آنکھیں مندر ہی تھیں، عزیز کی خفگی آمیز باتوں کا دبا دبا شور سنائی دیا۔ سمجھ میں تو کچھ نہ آیا لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ جانکی سے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔

صبح دس بجے عزیز نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور جانکی کا گرم کیا ہوا پانی ویسے ہی غسل خانے میں پڑا رہا۔ جب میں نے جانکی سے اس بات کا ذکر کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نہا دھو کر عزیز باہر چلا گیا۔ جانکی کمرے میں پلنگ پر لیٹی رہی۔ سہ پہر کو تین بجے کے قریب جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اسے بہت تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے باہر نکلا تو عزیز تانگے میں اسباب رکھوا رہا تھا۔

میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو تو اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا، بمبئی؛ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔

یہ کہہ کر وہ تانگے میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مجھے یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ جانکی کو بہت تیز بخار ہے۔

ڈاکٹر نے جانکی کو اچھی طرح دیکھا اور مجھے بتایا کہ اسے برونکائٹس ہے، اگر احتیاط نہ
برتی تو نمونیا ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نسخہ دے کر چلا گیا تو جانکی نے عزیز کے بارے میں پوچھا۔
پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے نہ بتاؤں لیکن چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں تھا، اس لئے میں نے کہہ دیا
کہ چلا گیا ہے۔ یہ سن کر اسے بہت صدمہ ہوا۔ دیر تک وہ تکئے میں سر دے کر روتی رہی۔

دوسرے روز صبح گیارہ بجے کے قریب جب کہ جانکی کا بخار ایک ڈگری ہلکا تھا اور
طبیعت بھی کسی قدر درست تھی بمبئی سے سعید کا تار آیا جس میں بڑے درشت لفظوں میں یہ لکھا تھا
"یاد رہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔" میں بہت منع کرتا رہا لیکن وہ تیز بخار ہی میں پونہ
ایکسپریس سے بمبئی روانہ ہوگئی۔

پانچ چھ دنوں کے بعد نرائن کا تار آیا "ایک ضروری کام ہے، فوراً بمبئی چلے آؤ۔" میرا
خیال تھا کہ کسی پروڈیوسر سے اس نے میرے کنٹریکٹ کی بات کی ہوگی، لیکن بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا
کہ جانکی کی حالت بہت نازک ہے۔ برونکائٹس بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ
جب وہ پونہ سے بمبئی پہنچی تھی تو اندھیری جانے کے لئے چلتی ٹرین میں چڑھنے کی کوشش کرتے
ہوئے گر پڑی تھی جس کے باعث اس کی دونوں رانیں بہت بُری طرح چھل گئی تھی۔

جانکی نے اس جسمانی تکلیف کو بڑی بہادری سے برداشت کیا۔ لیکن جب وہ اندھیری
پہنچی اور سعید نے اس کے بندھے ہوئے اسباب کی طرف اشارہ کرکے کہا "مہربانی کرکے یہاں
سے چلی جاؤ" تو اسے بہت روحانی تکلیف ہوئی۔ نرائن نے مجھے بتایا: "سعید کے منہ سے یہ برف
جیسے ٹھنڈے لفظ سن کر وہ ایک لمحے کے لئے بالکل پتھر ہوگئی میرا خیال ہے اس نے تھوڑی دیر کے
بعد یہ ضرور سوچا ہوگا میں گاڑی کے نیچے آکر کیوں نہ مرگئی۔ سعادت تم کچھ بھی کہو مگر سعید عورتوں
سے جیسا سلوک کرتا ہے بہت ہی نامردانہ ہے۔ بے چاری کو بخار تھا۔ چلتی ریل سے گر پڑی تھی
اور وہ بھی اس خر ذات کے پاس جلدی پہنچنے کے باعث۔ لیکن اس نے ان باتوں کا خیال ہی نہ کیا
اور ایک بار پھر اس سے کہا۔ مہربانی کرکے یہاں سے چلی جاؤ — اس کے لہجے میں منٹو کسی جذبے
کا اظہار نہیں تھا۔ بس ایسا تھا جیسے لنوٹائپ مشین سے اخبار کی ایک سطر ڈھل کر باہر نکل آئے۔ مجھے
بہت دکھ ہوا، چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ شام کو جب واپس آیا تو جانکی موجود نہیں تھی لیکن
سعید پلنگ پر بیٹھا، رم کا گلاس سامنے رکھے ایک نظم لکھنے میں مصروف تھا۔

میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرے روز اسٹوڈیو
سے معلوم ہوا کہ جانکی ایک اکسٹرا لڑکی کے گھر خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ میں نے اسٹوڈیو

کے مالک سے بات کی اور اسے ہسپتال بھجوا دیا۔ کل سے وہیں ہے، بتاؤ اب کیا کیا جائے۔ میں تو اسے دیکھنے جا نہیں سکتا اس لئے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے ــــ تم جاؤ اور دیکھ کر آؤ کس حالت میں ہے۔"

میں ہسپتال گیا تو اس نے سب سے پہلے عزیز اور سعید کے متعلق پوچھا۔ جو سلوک ان دونوں نے اس کے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد اس کے پُر خلوص استفسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔

اس کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ دونوں پھیپھڑوں پر ورم ہے اور جان کا خطرہ ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ جانکی اتنی بڑی تکلیف مردانہ وار برداشت کر رہی تھی۔

ہسپتال سے لوٹا اور اسٹوڈیو میں نرائن کو تلاش کیا تو معلوم ہوا وہ صبح ہی سے غائب ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے مجھے تین چھوٹی شیشیاں دکھائیں جن کا منہ ربڑ سے بند تھا: "جانتے ہو یہ کیا ہے؟"

میں نے کہا معلوم نہیں۔ انجکشن سے لگتے ہیں۔"

نرائن مسکرایا: "انجکشن ہی ہیں لیکن پنسلین کے۔"

مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ پنسلین اس وقت بہت ہی قلیل مقدار میں تیار ہوتی۔ امریکہ اور انگلستان میں جتنی بنتی ہے، تھوڑی تھوڑی۔ ملٹری ہسپتالوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔

چنانچہ میں نے نرائن سے پوچھا: "یہ تو بالکل نایاب چیز ہے، تمہیں کیسے مل گئی؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا: "بچپن میں گھر کی تجوری کھول کر روپے چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ آج دائیں ہاتھ سے ملٹری ہوسپٹل کا ریفریجریٹر کھول کر میں نے یہ تین بلب چرائے ہیں............ چلو جلدی کرو جانکی کو ہسپتال سے ہوٹل میں لے چلیں۔"

ٹیکسی لے کر میں ہسپتال گیا اور جانکی کو اس ہوٹل میں لے گیا جس میں نرائن دو کمروں کا پہلے ہی بندوبست کر چکا تھا۔

جانکی نے مجھ سے کئی بار نحیف آواز میں پوچھا کہ میں اسے ہوٹل میں کیوں لایا ہوں۔ ہر بار میں نے یہی جواب دیا: "تمہیں معلوم ہو جائے گا۔"

اور جب اسے معلوم ہوا۔ یعنی جب نرائن سرنج ہاتھ میں لئے اسے ٹیکہ لگانے کے لئے اس کمرے میں آیا تو نفرت سے ایک طرف اس نے منہ پھیر لیا اور مجھ سے کہا: "سعادت صاحب اس سے کہئے چلا جائے یہاں سے۔"

نرائن مسکرایا: "جانِ من غصہ تھوک دو۔ یہاں تمہاری جان کا سوال ہے۔" جانکی کو

ہوش آ گیا نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی: ''سعادت صاحب! میں جاتی ہوں یہاں سے یا آپ اس حرام خور کو نکالیے باہر۔''

نرائن نے دھکا دے کر اسے الٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا:

''یہ حرام زادہ تمہیں انجکشن لگا کر ہی رہے گا۔ خبردار جو تم نے مزاحمت کی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ جانکی کا بازو پکڑا، سرنج مجھے دے کر اس نے اسپرٹ میں روئی بھگوئی اور اس کا ڈنٹر صاف کیا۔ اس کے بعد روئی مجھے دے کر اس نے سرنج کی سوئی اس کے بازو کی مچھلی میں داخل کر دی وہ چیخی، لیکن پنسلین اس کے جسم میں جا چکی تھی۔

جب نرائن نے جانکی کا بازو اپنی مضبوط گرفت سے علیحدہ کیا تو اس نے رونا شروع کر دیا۔ نرائن نے اس کی بالکل پرواہ نہ کی اور اسپرٹ لگی روئی سے انجکشن والا حصہ پونچھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پہلا انجکشن رات کے نو بجے دیا تھا۔ دوسرا تین گھنٹے بعد دینا تھا۔ نرائن نے مجھے بتایا کہ تین کے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تو پنسلین کا اثر بالکل زائل ہو جائے گا، چنانچہ وہ جاگتا رہا تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اس نے اسٹوو جلایا، سرنج ابالی اور اس میں دوا بھری۔

جانکی خرخراہٹ بھرے سانس لے رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ نرائن نے دوسرے بازو کو اسپرٹ سے صاف کیا اور سرنج کی سوئی اندر کھبو دی۔ جانکی کے ہونٹوں سے پتلی سی چیخ نکلی۔ نرائن نے دوا جسم کے اندر بھیج کر سوئی باہر نکالی اور اسپرٹ سے انجکشن والی جگہ صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہا: ''اب تیسرا تین بجے''

مجھے معلوم نہیں اس نے تیسرا چوتھا انجکشن کب دیا۔ لیکن جب بیدار ہوا تو اسٹوو جلنے کی آواز آ رہی تھی اور نرائن ہوٹل کے بیرے سے برف کے لئے کہہ رہا تھا کیونکہ اس پنسلین کو ٹھنڈا رکھنا تھا۔

نو بجے پانچواں انجکشن دینے کے لئے جب ہم دونوں جانکی کے کمرے میں گئے تو وہ آنکھیں کھولے لیٹی تھی۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے نرائن کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔ نرائن مسکرایا: ''کیوں جانِ من! کیا حال ہے؟''

جانکی خاموش رہی۔

نرائن اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ''یہ انجکشن جو میں تمہیں دے رہا ہوں عشق کے انجکشن نہیں۔ تمہارا نمونیہ دور کرنے کے انجکشن ہیں میں نے ملٹری ہوسپٹل سے بڑی صفائی کے ساتھ

چرائے ہیں.........لو، اب ذرا الٹی لیٹ جاؤ اور کولہے پر سے شلوار کو ذرا نیچے کھسکا دو......
کبھی لیا ہے یہاں انجکشن؟''

یہ کہہ کر اس نے جانکی کے کولہے پر ایک جگہ گوشت کے اندر انگلی کھبوئی۔ جانکی کی آنکھوں میں مرعوب سی نفرت پیدا ہوئی۔

جب اس نے کروٹ بدلی تو نرائن نے کہا: ''شاباش!''

پیشتر اس کے کہ جانکی کوئی مزاحمت کرے نرائن نے ایک ہاتھ سے اس کی شلوار نیچے کھسکائی اور مجھ سے کہا: ''اسپرٹ لگاؤ!''

جانکی نے ٹانگیں چلانا شروع کیں تو نرائن نے کہا: ''جانکی! ٹانگیں وانگیں مت چلاؤ ......میں انجکشن لگا کے رہوں گا۔''

غرض کہ پانچواں انجکشن دے دیا گیا۔ پندرہ اور باقی تھے جو نرائن کو ہر تین گھنٹے کے بعد دینے تھے۔ اور یہ پینتالیس گھنٹے کا کام تھا۔

پانچ انجکشن سے گو جانکی کو بظاہر کوئی نمایاں فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ لیکن نرائن کو پنسلین کے اعجاز کا یقین تھا اور اسے پوری پوری امید تھی کہ وہ بچ جائے گی۔ ہم دونوں بہت دیر تک اس نئی دوا کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے قریب نرائن کا نوکر میرے نام ایک تار لے کر آیا۔ پونہ سے تھا۔ ایک فلم کمپنی نے مجھے فوراً بلایا تھا اس لئے مجھے جانا پڑا۔

دس پندرہ دنوں کے بعد کمپنی ہی کے کام سے میں بمبئی آیا۔ کام ختم کر کے جب میں اندھیری پہنچا تو سعید سے معلوم ہوا کہ نرائن ابھی تک ہوٹل ہی میں ہے۔ ہوٹل بہت دور، شہر میں تھا اس لئے رات میں وہیں اندھیری میں رہا۔

صبح آٹھ بجے وہاں پہنچا تو نرائن کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر داخل ہوا تو کمرہ خالی پایا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو ایک دم آنکھوں کے سامنے کچھ ہوا۔ جانکی مجھے دیکھتے ہی لحاف کے اندر گھس گئی۔ اور نرائن نے جو اس کے ساتھ لیٹا تھا، مجھے واپس جاتے دیکھ کر کہا۔

''آؤ منٹو آؤ..........میں ہمیشہ دروازہ بند کرنا بھول جاتا ہوں...... آؤ یار...... بیٹھو اس کرسی پر، لیکن یہ جانکی کی شلوار دے دینا!''

خوشیا

خوشیا سوچ رہا تھا

بنواری سے کالے تمبا کو والا پان لے کر وہ اس کی دکان کے ساتھ اس سنگین چبوترے پر بیٹھا تھا۔ جو دن کے وقت ٹائروں اور موٹروں کے مختلف پرزوں سے بھرا ہوتا ہے۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب موٹر کے پُرزے اور ٹائر بیچنے والوں کی یہ دکان بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کا سنگین چبوترہ خوشیا کے لئے خالی ہو جاتا ہے۔

وہ کالے تمبا کو والا پان آہستہ آہستہ چبا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ پان کی گاڑھی تمبا کو ملی پیک اس کے دانتوں کی ریخوں سے نکل کر اس کے منہ میں ادھر اُدھر پھسل رہی تھی اور اسے ایسا لگتا تھا کہ اس کے خیال دانتوں تلے پس کر اس کی پیک میں گھل رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشیا پان کی پیک منہ میں پلپلا رہا تھا اور اس واقعہ پر غور کر رہا تھا۔ جو اس کے ساتھ ابھی ابھی پیش آیا تھا یعنی آدھ گھنٹہ پہلے۔

وہ اس سنگین چبوترے پر حسب معمول بیٹھنے سے پہلے کھیت واڑی کی پانچویں گلی میں گیا تھا۔ منگلور سے جو نئی چھوکری کانتا آئی تھی۔ اسی گلی کے نکڑ پر رہتی تھی۔ خوشیا سے کسی نے کہا تھا کہ وہ اپنا مکان تبدیل کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے وہاں گیا تھا۔

کانتا کی کھولی کا دروازہ اس نے کھٹکھٹایا اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے؟'' اس پر خوشیا نے کہا ''میں خوشیا''

آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا۔خوشیا اندر داخل ہوا جب کانتا نے دروازہ اندر سے بند کیا تو خوشیا نے مڑ کر دیکھا اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے کانتا کو بالکل ننگا دیکھا۔بالکل ننگا ہی سمجھو کیونکہ وہ اپنے انگ کو صرف ایک تولئے سے چھپائے ہوئے تھی۔ چھپائے ہوئے بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ چھپانے کی کتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ تو سب کی سب خوشیا کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھیں۔

''کہو خوشیا کیسے آئے؟............ میں بس اب نہانے والی ہی تھی۔بیٹھو، بیٹھو.......... باہر والے سے اپنے لئے چائے کے لئے تو کہہ آئے ہوتے .... جانتے تو ہو وہ موا راما یہاں سے بھاگ گیا ہے''

خوشیا جس کی آنکھوں نے کبھی عورت کو یوں اچانک طور پر ننگا نہیں دیکھا تھا بہت گھبرا گیا۔اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے؟ اس کی نظریں جو ایک دم عریانی سے دو چار ہو گئی تھیں۔ اپنے آپ کو کہیں چھپانا چاہتی تھیں۔

اس نے جلدی جلدی صرف اتنا کہا'' جاؤ.......... جاؤ تم نہاؤ۔پھر ایک دم اس کی زبان کھل گئی'' پر جب تم ننگی تھیں تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟.......... اندر سے کہہ دیا ہوتا۔ میں پھر آ جاتا.......... لیکن جاؤ.......... تم نہا لو۔

کانتا مسکرائی'' جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے۔اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو..........''

کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔

اس کا جسم خوبصورت تھا۔ پہلی مرتبہ خوشیا کو معلوم ہوا کہ جسم بیچنے والی عورتیں بھی ایسا سڈول بدن رکھتی ہیں۔اس کو اس بات پر حیرت ہوئی تھی، سب سے زیادہ تعجب اسے اس بات پر ہوا تھا کہ ننگ دھڑنگ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس کو لاج تک نہ آئی۔کیوں؟

اس کا جواب کانتا نے یہ دیا تھا'' جب تم نے کہا خوشیا ہے تو میں نے سوچا کیا حرج ہے۔اپنا خوشیا ہی تو ہے۔ آنے دو'' کیا ہرج ہے۔

کانتا اور خوشیا ایک ہی پیشے میں شریک تھے۔وہ اس کا دلال تھا۔اس لحاظ سے وہ اسی کا تھا.......... پر یہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس کے سامنے ننگی ہو جاتی۔کوئی خاص بات تھی۔کانتا کے الفاظ

میں خوشیا کوئی اور ہی مطلب کریدر ہا تھا۔

یہ مطلب بیک وقت اس قدر صاف اور اس قدر مبہم تھا کہ خوشیا کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پرواہ! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانولے سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں مگر اس کا ایک رواں تک بھی نہ کپکپایا تھا۔ بس سانولے پتھر کی مورتی کے مانند کھڑی رہی جو احساس سے عاری ہو۔

بھئی، ایک مرد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مرد جس کی نگاہیں کپڑوں میں بھی عورت کے جسم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو پرماتما جانے خیال ہی خیال میں کہاں کہاں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی اور...... اور اس کی آنکھیں ایسا سمجھ لو کہ ابھی لانڈری سے دھل کر آئی ہیں...... اس کو تھوڑی سی لاج تو آنی چاہئے تھی۔ ذرا سی سُرخی تو اس کے دیدوں میں پیدا ہونی چاہئے۔ مان لیا۔ کسبی تھی پر کسبیاں یوں ننگی تو نہیں کھڑی ہو جاتیں"۔

دس برس اس کو دلالی کرتے ہو گئے تھے۔ اور ان دس برسوں میں وہ پیشہ کرنے والی لڑکیوں کے تمام رازوں سے واقف ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اسے یہ معلوم تھا کہ پائے دھونی کے آخری سرے پر جو چھوکری ایک نوجوان لڑکے کو بھائی بنا کر رہتی ہے اس کے لئے اچھوت کنیا کا ریکاڈ "کاہے کرتا مورکھ پیار، پیار، پیار" اپنے ٹوٹے ہوئے باجے پر بجایا کرتی ہے کہ اسے اشوک کمار سے بہت بُری طرح عشق ہے۔ کئی منچلے لونڈے اشوک کمار سے اس کی ملاقات کرانے کا جھانسہ دے کر اپنا الو سیدھا کر چکے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دادر میں جو پنجابن رہتی ہے۔ صرف اس لئے کوٹ پتلون پہنتی ہے کہ اس کے ایک یار نے اس سے کہا تھا کہ تیری ٹانگیں تو بالکل اس انگریز ایکٹرس کی طرح ہیں۔ جس نے "مراکو عرف خونِ تمنا" میں کام کیا تھا۔ یہ فلم اس نے کئی بار دیکھا اور جب اس کے یار نے کہا کہ مارلین ڈیٹرچ اس لئے پتلون پہنتی ہے کہ اس کی ٹانگیں بہت خوبصورت ہیں اور ان ٹانگوں کا اس نے دو لاکھ کا بیمہ کرا رکھا ہے تو اس نے بھی پتلون پہننا شروع کر دی۔ جو اس کے چوتڑوں میں بہت پھنس کر آتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ "مزگاؤں" والی دکھشنی چھوکری صرف اس لئے کالج کے خوبصورت لونڈوں کو پھانستی ہے کہ اسے ایک خوبصورت بچے کی ماں بننے کا شوق ہے۔ اس کو یہ بھی پتہ تھا کہ وہ کبھی اپنی خواہش پوری نہ کر سکے گی۔ اس لئے کہ بانجھ ہے اور اس کالی مدراسن کی بابت جو ہر وقت کانوں میں ہیرے کی

''بوٹیاں'' پہنے رہتی تھی۔ اس کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کا رنگ کبھی سفید نہیں ہوگا۔ اور وہ ان دواؤں پر بیکار روپیہ برباد کر رہی ہے جو آئے دن خریدتی رہتی ہے۔

اس کو ان تمام چھوکریوں کا اندر باہر کا حال معلوم تھا جو اس کے حلقے میں شامل تھیں مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک روز کانتا کماری جس کا اصلی نام اتنا مشکل تھا کہ وہ عمر بھر یاد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے ننگی کھڑی ہو جائے گی۔ اور اس کو زندگی کے سب سے بڑے تعجب سے دوچار کرائے گی۔

سوچتے سوچتے اس کے منہ میں پان کی پیک اس قدر جمع ہو گئی تھی کہ اب وہ مشکل سے چھالیا کے ان ننھے ریزوں کو چبا سکتا تھا جو اس کے دانتوں کی ریخوں میں سے ادھر اُدھر پھسل کر نکل جاتے تھے۔

اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہے...... اس کے مردانہ وقار کو دھکا سا پہنچا تھا۔ جب وہ کانتا کے ننگے جسم کو اپنے تصوّر میں لاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا اپمان ہوا ہے۔

ایک دم اس نے اپنے دل میں کہا۔ ''بھئی یہ اپمان نہیں ہے تو کیا ہے.......... یعنی ایک چھوکری ننگ دھڑنگ تمہارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے؟— تم خوشیا ہی تو ہو— خوشیا نہ ہوا، سالا وہ بِلاّ ہو گیا جو اس کے بستر پر ہر وقت اونگھتا رہتا ہے ......اور کیا؟''

اب اسے یقین ہونے لگا کہ سچ مچ اس کی ہتک ہوئی ہے۔ وہ مرد تھا اور اس کو اس بات کی غیر محسوس طریق پر توقع تھی کہ عورتیں خواہ شریف ہوں یا بازاری اس کو مرد ہی سمجھیں گی۔ اور اس کے اور اپنے درمیان وہ پردہ قائم رکھیں گی جو ایک مدّت سے چلا آ رہا ہے۔ وہ تو صرف یہ پتہ لگانے کے لئے کانتا کے یہاں گیا تھا کہ وہ کب مکان تبدیل کر رہی ہے؟ اور کہاں جا رہی ہے؟ کانتا کے پاس اس کا جانا یکسر بزنس سے متعلق تھا اگر خوشیا کانتا کی بابت سوچتا کہ جب وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ تو وہ اندر کیا کر رہی ہوگی۔ تو اس کے تصوّر میں زیادہ سے زیادہ اتنی باتیں آسکتی تھیں۔

سر پر پٹی باندھے لیٹ رہی ہوگی۔

بِلّے کے بالوں میں سے پسّو نکال رہی ہوگی۔

اس پوڈر سے اپنی بغلوں کے بال اُڑا رہی ہوگی جو اتنی باس مارتا تھا کہ خوشیا کی ناک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

پلنگ پر اکیلی بیٹھی تاش پھیلائے پیشنس کھیلنے میں مشغول ہوگی

بس اتنی چیزیں تھیں جو اس کے ذہن میں آتیں۔ گھر میں وہ کسی کو رکھتی نہیں تھی اس لئے اس بات کا خیال ہی نہیں آسکتا تھا۔ پر خوشیا نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ تو کام سے وہاں گیا تھا کہ اچانک کانتا...... یعنی کپڑے پہننے والی کانتا...... مطلب یہ کہ وہ کانتا جس کو وہ ہمیشہ کپڑوں میں دیکھا کرتا تھا۔ اس کے سامنے بالکل ننگی کھڑی ہوگئی...... بالکل ننگی ہی سمجھو کیونکہ یہ ایک چھوٹا سا تولیہ سب کچھ تو چھپا نہیں سکتا۔ خوشیا کو یہ نظارہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا تھا۔ جیسے چھلکا اس کے ہاتھ میں رہ گیا ہے اور کیلے کا گودا پرچ کر کے اس کے سامنے آگرا ہے۔ نہیں اسے کچھ اور ہی محسوس ہوا تھا...... جیسے جیسے وہ خود ننگا ہو گیا ہے۔ اگر بات یہاں تک ہی ختم ہو جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خوشیا اپنی حیرت کو کسی نہ کسی حیلے سے دُور کر دیتا۔ مگر یہاں مصیبت یہ آن پڑی تھیں کہ اس لونڈیا نے مسکرا کر کہا تھا "جب تم نے کہا، خوشیا ہے، تو میں نے سوچا۔ اپنا خوشیا ہی تو ہے، آنے دو" ---- یہ بات اسے کھائے جا رہی تھی۔

"سالی مسکرا رہی تھی" ———— وہ بار بار بڑبڑاتا۔ جس طرح کانتا ننگی تھی۔ اسی طرح اس کی مسکراہٹ خوشیا کو ننگی نظر آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ ہی نہیں، اسے کانتا کا جسم بھی اس حد تک نظر آیا تھا۔ گویا اس پر رندا پھیرا ہوا ہے۔

اسے بار بار بچپن کے وہ دن یاد آرہے تھے۔ جب پڑوس کی ایک عورت اس سے کہا کرتی تھی "خوشیا بیٹا، جا دوڑ کے جا، یہ بالٹی پانی سے بھر لا" جب وہ بالٹی بھر کے لایا کرتا تھا تو وہ دھوتی سے بنائے ہوئے پردے کے پیچھے سے کہا کرتی تھی۔ "اندر آکے، یہاں میرے پاس رکھ دے۔ میں نے منہ پر صابن ملا ہوا ہے۔ مجھے کچھ بجھائی نہیں دیتا" وہ دھوتی کا پردہ ہٹا کر بالٹی اس کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ اس وقت صابن کے جھاگ میں لپٹی ہوئی ننگی عورت اسے نظر آیا کرتی تھی۔ مگر اس کے دل میں کسی قسم کا ہیجان پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"بھئی میں اس وقت بچہ تھا۔ بالکل بھولا بھالا۔ بچے اور مرد میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بچوں سے کون پردہ کرتا ہے۔ مگر اب تو میں پورا مرد ہوں۔ میری عمر اس وقت اٹھائیس برس کے قریب ہے اور اٹھائیس برس کے جوان آدمی کے سامنے تو کوئی بوڑھی عورت بھی ننگی کھڑی نہیں ہوتی"

کانتا نے اسے کیا سمجھا تھا؟ کیا اس میں وہ تمام باتیں نہیں تھیں۔ جو ایک نوجوان مرد میں ہوتی ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ کانتا کو یک بیک ننگ دھڑنگ دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا۔ لیکن چور نگاہوں سے کیا اس نے کانتا کی ان چیزوں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ جو روزانہ استعمال کے

باوجود اصلی حالت پر قائم تھیں اور کیا تعجب کہ مرد ہوتے ہوئے اس کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ دس روپے میں، کانتا بالکل مہنگی نہیں اور دسہرے کے روز بینک کا وہ منشی جو دو روپے کی رعایت نہ ملنے پر واپس چلا گیا تھا۔ بالکل گدھا تھا اور...... ان کے سب کے اوپر، کیا، ایک لمحے کے لئے اس کے تمام پٹھوں میں ایک عجیب قسم کا کھنچاؤ پیدا نہیں ہو گیا تھا اور اس نے ایک ایسی انگڑائی نہیں لینا چاہی تھی۔ جس سے اس کی ہڈیاں تک چٹخنے لگیں؟...... پھر کیا وجہ تھی کہ منگلور کی اس سانولی چھوکری نے اس کو مرد نہ سمجھا اور صرف...... صرف خوشیا سمجھ کر اس کو اپنا سب کچھ دیکھنے دیا؟

اس نے غصے میں آ کر پان کی گاڑھی پیک تھوک دی۔ جس نے فٹ پاتھ پر کئی بیل بوٹے بنا دیئے۔ پیک تھوک کر وہ اٹھا اور ٹرام میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر میں اس نے نہا دھو کر نئی دھوتی پہنی۔ جس بلڈنگ میں رہتا تھا۔ اس کی ایک دکان میں سیلون تھا۔ اس کے اندر جا کر اس نے آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ پھر فوراً ہی کچھ خیال آیا تو کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی سے اس نے داڑھی مونڈنے کے لئے حجام سے کہا۔ آج چونکہ دوسری مرتبہ وہ داڑھی منڈوا رہا تھا۔ اس لئے حجام نے کہا۔ ''ارے بھئی خوشیا بھول گئے کیا؟ صبح میں نے ہی تو تمہاری داڑھی مونڈی تھی''۔ اس پر خوشیا نے بڑی متانت سے داڑھی پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کھونٹی اچھی طرح نہیں نکلی......''

اچھی کھونٹی نکلوا کر اور چہرے پر پاؤڈر ملوا کر وہ سیلون سے باہر نکلا سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا۔ بمبئی کے مخصوص انداز میں اس نے ''چھی چھی'' کر کے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور انگلی کے اشارے سے اسے ٹیکسی لانے کے لئے کہا جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے مڑ کر اس سے پوچھا ''کہاں جانا ہے صاحب؟''

ان چار لفظوں نے اور خاص طور پر ''صاحب'' نے خوشیا کو بہت مسرور کیا۔ مسکرا کر اس نے بڑے دوستانہ لہجہ میں جواب دیا ''بتائیں گے پہلے تم ''پسیرا ہاؤس کی طرف چلو لیمنگٹن روڈ میں سے ہوتے ہوئے۔ سمجھے!''

ڈرائیور نے میٹر کی لال جھنڈی کا سر نیچے کی طرف دبا دیا۔ ٹن ٹن ہوئی اور ٹیکسی نے لیمنگٹن روڈ کا رخ کیا۔ لیمنگٹن روڈ کا جب آخری سرا آ گیا تو خوشیا نے ڈرائیور کو ہدایت دی۔ بائیں طرف موڑ لو''۔

ٹیکسی بائیں ہاتھ مڑ گئی۔ ابھی ڈرائیور نے گیئر بھی نہ بدلا تھا کہ خوشیا نے کہا ''یہ سامنے والے کھمبے کے پاس روک لینا ذرا'' ڈرائیور نے عین کھمبے کے پاس ٹیکسی کھڑی کر دی۔ خوشیا

دروازہ کھول کر باہر نکلا اور ایک پان والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ یہاں سے اس نے ایک پان لیا اور اس آدمی سے جو کہ دکان کے پاس کھڑا تھا، چند باتیں کیں اور اسے اپنے ساتھ ٹیکسی پر بٹھا کر ڈرائیور سے کہا ''سیدھے لے چلو''!

دیر تک ٹیکسی چلتی رہی۔ خوشیا نے جدھر اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے ادھر ہینڈل پھیر دیا۔ مختلف پر رونق بازاروں میں سے ہوتے ہوئے ٹیکسی ایک نیم روشن گلی میں داخل ہوئی۔ جس میں آمد و رفت کم تھی۔ کچھ لوگ سڑک پر بستر جمائے لیٹے تھے ان میں سے کچھ بڑے اطمینان سے چمپی کرا رہے تھے۔ جب ٹیکسی ان چمپی کرانے والوں کے آگے نکل گئی اور ایک کاٹھ کے بنگلے نما مکان کے پاس پہنچی تو خوشیا نے ڈرائیور کو ٹھہرنے کے لئے کہا ''بس اب یہاں رُک جاؤ''۔ ٹیکسی ٹھہر گئی تو خوشیا نے اس آدمی سے جس کو وہ پان والے کی دکان سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ آہستہ سے کہا جاؤ۔ میں یہاں انتظار کرتا ہوں۔ وہ آدمی بیوقوفوں کی طرح خوشیا کی طرف دیکھتا ہوا ٹیکسی سے باہر نکلا اور سامنے والے چوبی مکان میں داخل ہو گیا۔

خوشیا جم کر ٹیکسی کے گدے پر بیٹھ گیا۔ ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ کر اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ایک دو کش لے کر باہر سڑک پر پھینک دی۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس لئے اسے ایسا لگا کہ ٹیکسی کا انجن بند نہیں ہوا اس کے سینے میں چونکہ پھڑپھڑاہٹ ہو رہی تھی۔ اس لئے وہ سمجھا کہ ڈرائیور نے بل بڑھانے کی غرض سے پٹرول چھوڑ رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے تیزی سے کہا ''یوں بیکار انجن چالو رکھ کر تم کتنے پیسے اور بڑھا لو گے؟

ڈرائیور نے مڑ کر خوشیا کی طرف دیکھا اور کہا ''سیٹھ انجن تو بند ہے''۔

جب خوشیا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا اور اس نے کچھ کہنے کے بجائے اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دئے۔ پھر ایکا ایکی سر پر وہ کشتی نما کالی ٹوپی پہن کر جو اب تک اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اس نے ڈرائیور کا شانہ ہلایا اور کہا۔ ''دیکھو ابھی ایک چھوکری آئے گی جونہی اندر داخل ہو تم موٹر چلا دینا۔ سمجھے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے معاملہ ایسا ویسا نہیں''۔

اتنے میں سامنے چوبی مکان سے دو آدمی باہر نکلے آگے آگے خوشیا کا دوست تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے کانتا جس نے شوخ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔

خوشیا جھٹ سے اس طرف کو سرک گیا۔ جدھر اندھیرا تھا خوشیا کے دوست نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور کانتا کو اندر داخل کر کے دروازہ بند کر دیا فوراً ہی کانتا کی حیرت بھری آواز سنائی

دی جو چیخ سے ملتی جلتی تھی۔ خوشیا تم"—"ہاں میں۔ لیکن تمہیں روپے مل گئے ہیں نا؟" خوشیا کی موٹی آواز بلند ہوئی دیکھو ڈرائیور۔ جوہو لے چلو۔"

ڈرائیور نے سلف دبایا۔ انجن پھڑ پھڑانا شروع ہوا، وہ بات جو کانتا نے کہی سنائی نہ دے سکی۔ ٹیکسی ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھی اور خوشیا کے دوست کو سڑک کے بیچ حیرت زدہ چھوڑ کر اس نیم روشن گلی میں غائب ہوگئی۔

اس کے بعد کسی نے خوشیا کو موٹروں کی دکان کے سنگین چبوترے پر نہیں دیکھا۔

دُھواں

وہ جب اسکول روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ ان کی کھالیں اُتری ہوئی تھیں اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں، پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شئے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ویسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے، آوازیں مدھم تھیں جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں چپکے چپکے۔ دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اُٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اُٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اُجلا پن نہیں تھا، روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شئے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا، اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گئے تھے۔ کچھ آرہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گئے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تھا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی، اس لیئے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔ سردی کی شدت اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سُرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے، ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ —— یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا: جب سکتر صاحب کا جنازہ اُٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ وہ بلبلا اُٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈیسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا۔ دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دُکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا، چھو کر دیکھے۔ چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر انگلی سے بکرے کے اس حصّے کو چھو کر دیکھا وہ ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔

مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے ابا جی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لئے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔ اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔ چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ گھر میں اپنے ابا جی سے پڑھ چکا تھا۔ کھیلنے کے لئے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی، اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سا رے گا ما آتا تھا۔ اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا: ''امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔ ان کی کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا، بالکل ویسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔''

''اچھا......!'' یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔

''ہاں...... اور میں نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔''

''اچھا......!'' یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

''...... اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔''

''اچھا......'' مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف

متوجہ ہوئی۔ ''کیسے پھڑ کتا تھا؟''

''یوں.........یوں''۔

مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

''پھر کیا ہوا؟'' یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لئے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔

''پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔''

''گرم تھا......! اچھا، مسعود یہ بتاؤ، تم میرا ایک کام کرو گے۔''

''بتایئے۔''

''آؤ، میرے ساتھ آؤ۔''

نہیں آپ پہلے بتایئے، کام کیا ہے۔''

''تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔''

''جی نہیں.........آپ پہلے کام بتایئے۔''

''دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے......میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا......اچھے بھائی جو ہوئے۔ اللہ کی قسم، بڑا درد ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

''یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب دیکھو، درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں۔ کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں......'' مسعود اُٹھ کھڑا ہوا اور راضی ہو گیا: ''چلئے، لیکن آپ سے یہ کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا......''

''شاباش، شاباش۔'' اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔

صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دُکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے: ''مسعود آج ضرور بارش ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اُٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا: ''دیکھیے باجی'' گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔''

"بہت اچھا، لیکن تم اب خدا کے لئے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ ادھر میرے پلنگ پر آکر جلدی کمر دباؤ، ورنہ یاد رکھو، بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔" کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔

مسعود نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کر دیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا۔ جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لئے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل ہی نہ تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی ——— اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھینچی بھینچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی، اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گئے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی: "شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح...... شاباش میرے بھائی......"

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں کے نیچے مچھلیاں تڑپ سی گئیں ——— بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دوہری ہو گئی۔

مسعود گرتے گرتے بچا لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہو گئی۔ اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے۔ چنانچہ اس نے کہا: "یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے کہ میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں......"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں اِدھر اُدھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی، اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا: "نا بھائی، میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم

وحشیوں کی طرح دباتے ہو......"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے: "نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا...... آپ اطمینان رکھئے، اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی......"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہو گیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر اُدھر پھسلنے لگیں ــــــ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسّے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسّا اسی طرح پھسلتا ہو گا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی، پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال آتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے سوچا: "کلثوم کو اگر ذبح کیا جائے تو کھال اُتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟" لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

"بس، بس"۔ کلثوم تھک گئی: "بس بس......"

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔ وہ پلنگ پر سے نیچے اُترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی شروع کر دی۔ ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے لیکن جب اس نے ارادہ کر کے مسعود کے لات جمانی چاہی تو مسعود اُچھل کر زد سے باہر ہو گیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بادل اور بھی جھک آئے تھے۔ پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کئے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔ مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔ جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اُٹھی۔ سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور ایک کبوتری پاس پاس پر پھلائے بیٹھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔ گل داؤدی اور نازبو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔ فضا میں نیندیں

کھلی ہوئی تھیں۔ ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور انسان کے اردگرد نرم نرم خواب
ں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔

مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان
توں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا۔ پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس
سوچ بچار میں اسے آرہا تھا۔

بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہو گئے اور
بانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم
کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہو گئے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے
لئے وہ باورچی خانے میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا۔ ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ
قبرستان سے واپس آگیا۔ باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے
کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔
بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر یہ سردی ناخوشگوار
معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔ مسعود جب فرش پر
لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو
راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے
پٹھوں میں ہلکی ہلکی دکھن پیدا ہو گئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزہ آیا۔ اس کے جسم کے
کس حصے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں، کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔ یہ چیز کیا تھی، اس کے متعلق
بھی مسعود کو علم نہیں تھا البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے
اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانے سے ہوتا ہوا
صحن میں آنکلا۔ کوئی باورچی خانے میں تھا نہ صحن میں۔ ادھر اُدھر جتنے کمرے تھے، سب کے سب
بند تھے۔ بارش اب رُک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک
بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔
اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی: ”کون؟“

”جی میں ہوں مسعود!“

اندر سے آواز آئی: ''کیا کر رہے ہو؟''

''جی کھیل رہا ہوں!''

''کھیلو......'' پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا: ''تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے، زیادہ شور نہ مچانا......''

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لئے سامنے والے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم باز ــــــ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ اس نے دونوں پٹ کھول دیے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔

مسعود کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کے دماغ پر دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا جس نے کچھ دیر کے لئے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔

بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر بھی ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا اور زیادہ زور لگانے پر تو ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا ــــــ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

ڈارلنگ

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب مشرقی اور مغربی پنجاب میں قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ کئی دن سے موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ آگ جو انجنوں سے نہ بجھ سکی تھی اس بارش نے چند گھنٹوں ہی میں ٹھنڈی کر دی تھی۔ لیکن جانوں پر باقاعدہ حملے ہو رہے تھے اور جوان لڑکیوں کی عصمت بدستور غیر محفوظ تھی۔ ہٹے کٹے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں باہر نکلتی تھیں اور ادھر ادھر چھاپے مار کر ڈری دبکی اور سہمی ہوئی لڑکیاں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

کسی کے گھر پر چھاپہ مارنا اور اس کے ساکنوں کو قتل کر کے ایک جوان لڑکی کو کاندھے پر ڈال کر لے جانا بظاہر بہت ہی آسان کام معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ''س'' کا بیان ہے کہ یہ محض لوگوں کا خیال ہے۔ کیونکہ اسے تو اپنی جان پر کھیل جانا پڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو ''س'' کا بیان کردہ واقعہ سناؤں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے آپ کو متعارف کرادوں۔ ''س'' ایک معمولی جسمانی اور ذہنی ساخت کا آدمی ہے۔ مفت کے مال سے اس کو اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی عام انسانوں کو ہوتی ہے۔ لیکن مال مفت سے اس کا سلوک دل بے رحم کا سا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک عجیب و غریب ٹریجڈی کا باعث بن گیا۔ جس کا علم اسے بہت دیر میں ہوا۔

اسکول میں ''س'' اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ ہر کھیل میں حصہ لیتا تھا۔ لیکن کھیلتے کھیلتے جب نوبت لڑائی تک جا پہنچتی تھی تو ''س'' اس میں سب سے پیش پیش ہوتا۔ کھیل میں وہ ہر قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کر جاتا تھا لیکن لڑائی کے موقع پر اس نے ہمیشہ ایمانداری سے کام

لیا۔ مصوری سے ''س'' کو بچپن ہی سے دلچسپی تھی۔ لیکن کالج میں داخل ہونے کے ایک سال بعد ہی اس نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر سائیکلوں کی دکان کھول لی۔

فساد کے دوران میں جب اس کی دکان جل کر راکھ ہو گئی تو اس نے لوٹ مار میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ انتقاماً کم اور تفریحاً زیادہ۔ چنانچہ اسی دوران میں اس کے ساتھ یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جو اس کہانی کا موضوع ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ''موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ منوں پانی برس رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی تیز و تند بارش کبھی نہیں دیکھی۔ میں اپنے گھر کی برساتی میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میرے سامنے لوٹے ہوئے مال کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ بے شمار چیزیں تھیں مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری دکان جل گئی تھی مجھے اس کا بھی کوئی اتنا خیال نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ میں نے لاکھوں کا مال تباہ ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا دماغ کی کیا کیفیت تھی۔۔۔ اتنے زور سے بارش ہو رہی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے اور ہر چیز خشک ہے۔۔۔ جلے ہوئے مرونڈوں کی سی بو آ رہی تھی۔۔ میرے ہونٹوں میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔ اس کے دھوئیں سے کچھ ایسی ہی بُو نکل رہی تھی جانے کیا سوچ رہا تھا اور شاید کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ ایک دم بدن پر کپکپی سی دوڑ گئی اور جی چاہا کہ ایک لڑکی اٹھا کر لے آؤں۔ جونہی یہ خیال آیا بارش کا شور سنائی دینے لگا اور کھڑکی کے باہر ہر چیز پانی میں شرابور نظر آنے لگی۔۔۔ میں اٹھا، سامنے لوٹے ہوئے مال کے ڈھیر سے سگریٹوں کا ایک نیا ڈبہ اٹھا کر میں نے برساتی پہنی اور نیچے اتر گیا۔

سڑکیں اندھیری اور سنسان تھیں۔ سپاہیوں کا پہرہ بھی نہیں تھا۔ میں دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اس دوران میں کئی لاشیں مجھے نظر آئیں۔ لیکن مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا گھومتا گھامتا میں سول لائنز کی طرف نکل گیا۔ لک پھری سڑک بالکل خالی تھی۔ جہاں جہاں بجری اکھڑی ہوئی تھی وہاں بارش جھاگ بن بن کر اڑ رہی تھی۔ دفعتاً مجھے موٹر کی آواز آئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک چھوٹی سی موٹر بے بی آسٹن اندھا دھند چلی آ رہی تھی۔ میں سڑک کے عین درمیان میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اس انداز سے ہلانے لگا، جس کا مطلب یہ تھا کہ رک جاؤ۔

''موٹر بالکل پاس آ گئی۔ مگر اس کی رفتار میں فرق نہ آیا۔ چلانے والے نے رخ بدلا۔ میں بھی پینترہ بدل کر ادھر ہو گیا۔ موٹر تیزی سے دوسری طرف بڑھی، مگر اب اس کی رفتار دھیمی ہو گئی تھی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔۔۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ سوچتا مجھے زور سے دھکا لگا اور میں اکھڑ کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔ جسم کی تمام ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں مگر مجھے چوٹ نہ آئی۔ موٹر کے بریک

چیخے، پہیئے ایک دم پھسلے اور موٹر تیرتی ہوئی سامنے والے فٹ پاتھ پر چڑھ کر ایک درخت سے ٹکرائی اور ساکت ہوگئی۔ میں اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ موٹر کا دروازہ کھلا اور ایک عورت سرخ رنگ کا بھڑکیلا مومی رین کوٹ پہنے باہر نکلی۔ میری کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں ٹھیک ہوگئیں اور جسم میں حرارت پیدا ہوگئی۔ رات کے اندھیرے میں مجھے صرف اس کا شوخ رنگ رین کوٹ ہی دکھائی دیا۔ لیکن اتنا اشارہ کافی تھا کہ اس مومی کپڑے میں لپٹا ہوا جو کوئی بھی ہے۔ صنف نازک میں سے ہے۔"

"میں جب اس کی طرف بڑھا تو اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ بارش کے لرزتے پردے میں سے مجھے دیکھ کر بھاگی۔ مگر میں نے چند گزوں ہی میں اسے جالیا۔ جب ہاتھ اس کے چکنے رین کوٹ پر پڑا تو انگریزی میں چلائی: "ہیلپ ہیلپ۔"

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور گود میں اٹھالیا۔ وہ پھر انگریزی میں چلائی۔ "ہیلپ ہیلپ --ہی از کلنگ می۔"

میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔ " آر یو اے انگلش وومن"۔ فقرہ منہ سے نکل گیا تو خیال آیا کہ اے کی جگہ مجھے این کہنا چاہئے تھا۔ اس نے جواب دیا۔ "نو۔"

انگریز عورتوں سے مجھے نفرت ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا: " دن اٹ از آل رائیٹ۔"

اب وہ اردو میں چلانے لگی۔ " تم مار ڈالو گے مجھے۔ تم مار ڈالو گے مجھے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس لئے کہ میں اس کی آواز سے اس کی شکل، صورت اور عمر کا اندازہ لگا رہا تھا۔ لیکن ڈری ہوئی آواز سے کیا پتا چل سکتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر سے ہڈ ہٹانے کی کوشش کی، پر اس نے دونوں ہاتھ آگے رکھ دیے۔ میں نے کہا۔ ہٹاؤ اور سیدھا موٹر کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر اس کو پچھلی سیٹ پر ڈالا اور خود اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گیئر درست کر کے سلف دبایا تو انجن چل پڑا--- میں نے کہا۔ ٹھیک ہے۔ ہینڈل گھمایا۔ گاڑی کو فٹ پاتھ پر سے اتارا اور سڑک میں پہنچ کر ایکسلیٹر پر پیر رکھ دیا--- موٹر تیرنے لگی۔

گھر پہنچ کر میں نے پہلے سوچا کہ اوپر برساتی ٹھیک رہے گی۔ لیکن اس خیال سے کہ لونڈیا کو اوپر لے جانے میں جھک جھک کرنا پڑے گی، اس لئے میں نے نوکر سے کہا۔ " دیوان خانہ کھول دو"۔ اس نے دیوان خانہ کھولا تو میں نے اسے گھپ اندھیرے ہی میں صوفے پر ڈال دیا۔ سارا رستہ خاموش رہی تھی لیکن صوفے پر گرتے ہی چلانے لگی۔ " ڈونٹ کل می--- ڈونٹ کل می پلیز۔"

مجھے ذرا شاعری سوجھی۔ ’’آئی وونٹ کل یو --- آئی وونٹ کل یو ڈارلنگ۔‘‘

وہ رونے لگی۔ میں نے نوکر سے کہا۔ چلے جاؤ۔ وہ چلا گیا۔ میں نے جیب سے دیا سلائی نکالی۔ ایک ایک کر کے ساری تیلیاں نکالیں مگر ایک بھی نہ سلگی، اس لئے کہ بارش میں ان کے مصالحے کا بالکل فالودہ ہو گیا تھا۔ بجلی کا کرنٹ کئی دنوں سے غائب تھا --- اوپر برساتی میں لوٹے ہوئے مال کے ڈھیر میں کئی بیٹریاں تھیں۔ لیکن میں نے کہا اندھیرے ہی میں ٹھیک ہے، مجھے کون سی فوٹو گرافی کرنی ہے --- چنانچہ برساتی اتار کر میں نے ایک طرف پھینک دی اور اس سے کہا: ’’لایئے میں آپ کا رین کوٹ اتار دوں۔‘‘

میں نیچے صوفے کی جانب جھکا۔ لیکن وہ غائب تھی۔ میں بالکل نہ گھبرایا۔ اس لئے کہ دروازہ نوکر نے باہر سے بند کر دیا تھا۔ گھپ اندھیرے میں ادھر ادھر میں نے اسے تلاش کرنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بھڑ گئے اور تپائی کے ساتھ ٹکرا کر گر پڑے۔ فرش پر لیٹے لیٹے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو گردن پر جا پڑا، وہ چیخی، میں نے کہا۔ ’’چیختی کیوں ہو --- میں تمہیں ماروں گا نہیں۔‘‘

اس نے پھر سسکیاں لینا شروع کر دیں۔ شاید اس کا پیٹ ہی تھا جس پر میرا ہاتھ پڑا۔ وہ دہری ہو گئی۔ میں نے جیسا بھی بن پڑا اس کے رین کوٹ کے بٹن کھولنے شروع کر دیئے۔ موی کپڑا بھی کچھ عجیب ہوتا ہے جیسے بوڑھے گوشت میں چکنی چکنی جھریاں پڑی ہوں۔ وہ روتی رہی اور ادھر ادھر لیٹ کر مزاحمت کرتی رہی۔ لیکن میں نے پورے بٹن کھول دیئے۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ساڑی پہنے تھی --- میں نے کہا یہ ٹھیک رہا۔ چنانچہ میں نے ذرا معاملہ دیکھا --- خاصی سڈول پنڈلی تھی جس کے ساتھ میرا ہاتھ لگا --- وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ میں پہلے ذرا یوں ہی سلسلہ کر رہا تھا۔ پنڈلی کے ساتھ جب میرا ہاتھ لگا تو بدن میں چار سو چالیس والٹ پیدا ہو گئے۔ لیکن میں نے فوراً ہی بریک لگا دیئے کہ کہیں کچے سوئیٹا ہوئے --- چنانچہ میں نے شاعری شروع کر دی۔ ’’ڈارلنگ، میں تمہیں یہاں قتل کرنے کے لئے نہیں لایا --- ڈرو نہیں --- یہاں تم زیادہ محفوظ ہو --- جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ لیکن باہر لوگ درندوں کی طرح چیر پھاڑ دیں گے --- جب تک یہ فساد ہیں تم میرے ساتھ رہنا --- تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، میں نہیں چاہتا --- کہ تم گنواروں کے چنگل میں پھنس جاؤ ---‘‘

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ’’یو وونٹ کل می؟‘‘

میں نے فوراً ہی کہا۔ ’’نو سر۔‘‘

وہ ہنس پڑی۔ مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ عورت کو سر نہیں کہا کرتے۔ بہت خفت ہوئی۔ لیکن اس کے ہنس پڑنے سے مجھے کچھ حوصلہ ہوگیا۔ میں نے کہا معاملہ پٹا سمجھو۔ چنانچہ میں بھی ہنس پڑا۔ ''ڈارلنگ، میری انگریزی کمزور ہے۔''

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''اگر تم مجھے مارنا نہیں چاہتے تو یہاں کیوں لائے ہو؟''

سوال بڑا بے ڈھب تھا۔ میں نے جواب سوچنا شروع کیا۔ لیکن تیار نہ ہوا۔ میں نے کہا جو منہ میں آئے کہہ دو۔ ''میں تمہیں مارنا بالکل نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ مجھے یہ کام بالکل اچھا نہیں لگتا۔۔۔ تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟۔۔۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں اکیلا تھا۔''

وہ بولی ''تمہارا نوکر تمہارے پاس رہتا ہے۔''

میں نے بے سوچے سمجھے جواب دے دیا۔ ''اس کا کیا ہے۔ وہ تو نوکر ہے۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ میرے دماغ میں نیکی کے خیال آنے لگے۔ میں نے کہا ہٹاؤ، چنانچہ اٹھ کر اس سے کہا۔ ''تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ اٹھو''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک دم مجھے اس کی پنڈلی کا خیال آ گیا اور میں نے زور سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کی گرم گرم سانس میری ٹھوڑی کے نیچے گھس گئی۔ میں نے انکل پچو اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر جما دیئے۔ وہ لرزنے لگی۔ میں نے کہا ڈارلنگ ڈرو نہیں۔ میں تمہیں ماروں گا نہیں۔''

''چھوڑو مجھے۔'' اس کی آواز میں عجیب و غریب قسم کی کپکپاہٹ تھی۔ میں نے اسے اپنی گرفت سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن فوراً ہی اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ سڑک پر اسے اٹھاتے وقت مجھے محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ اس کے کولھوں کا گوشت بہت ہی نرم تھا۔۔۔ ایک بات مجھے اور بھی معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ میں نے اسے صوفے پر لٹا دیا اور بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ''اگر اس میں کوئی قیمتی چیز ہے تو یقین رکھو یہاں بالکل محفوظ رہے گی۔۔۔ بلکہ چاہو تو میں بھی تمہیں کچھ دے سکتا ہوں۔''

وہ بولی ''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔''

''لیکن مجھے چاہئے۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''تم۔''

وہ خاموش ہوگئی۔۔۔ میں فرش پر بیٹھ کر اس کی پنڈلی سہلانے لگا۔ وہ کانپ اٹھی۔ لیکن میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے جب کوئی مزاحمت نہ کی تو میں نے سوچا کہ مجبوری کی وجہ سے بیچاری نے اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے میری طبیعت کچھ کھٹی سی ہونے لگی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "دیکھو، میں زبردستی کچھ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں منظور نہیں ہے تو جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا جو کہ دھک دھک کر رہا تھا۔ میرا بھی دل اچھلنے لگا۔ میں نے زور سے "ڈارلنگ" کہا اور اس کے ساتھ چمٹ گیا۔

دیر تک چوما چاٹی ہوتی رہی۔ وہ سسکیاں بھر بھر کے مجھے ڈارلنگ کہتی رہی۔ میں بھی کچھ اسی قسم کی خرافات بکتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا: "یہ رین کوٹ اتار دو۔۔۔ بہت ہی واہیات ہے۔"

اس نے جذبات بھری آواز میں کہا۔ "تم خود ہی اتار دو نا۔"

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور کوٹ اس کے بازوؤں میں سے کھینچ کر اُتار دیا۔

اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "کون ہو تم۔"

میں اپنا حدود اربع بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ "تمہارا ڈارلنگ!"

اس نے "یو آر اے نوٹی بوائے۔" کہا اور اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں اس کا بلاؤز اتارنے لگا تو اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور التجا کی "مجھے ننگا نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "کیا ہوا۔۔۔ اس قدر اندھیرا ہے۔"

"نہیں، نہیں۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ۔۔۔" اس نے میرے دونوں ہاتھ اٹھا کر چومنے شروع کر دیے اور لرزاں آواز میں کہنے لگی۔ "نہیں نہیں۔۔۔ مجھے شرم آتی ہے۔"

عجیب سی بات تھی۔ لیکن میں نے کہا۔ چلو ہٹاؤ چھوڑو بلاؤز کو آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا تو اس نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تم ناراض تو نہیں ہو گئے۔"

مجھے کچھ معلوم ہی نہیں تھا کہ میں ناراض ہوں یا کیا ہوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔ "نہیں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔۔۔ تم بلاؤز نہیں اتارنا چاہتی ہو، نہ اتارو۔۔۔ لیکن۔۔۔" اس سے آگے کہتے ہوئے مجھے شرم آ گئی۔ لیکن ذرا گول کر کے میں نے کہا۔ "لیکن کچھ ہونا چاہئے۔ میرا مطلب ہے کہ ساڑی اتار دو۔۔۔"

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا حلق سوکھ گیا۔

میں نے بڑے پیار سے کہا: ''کس سے ڈر لگتا ہے۔''

''اسی سے --اسی سے۔'' اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔

میں نے اسے تسلی دی کہ ڈرنے کی وجہ کوئی بھی نہیں۔ ''میں تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔ لیکن اگر تمہیں واقعی ڈر لگتا ہے تو جانے دو---دو تین دن یہاں رہو جب میری طرف سے تمہیں پورا اطمینان ہو جائے تو پھر سہی۔''

اس نے روتے روتے کہا۔ ''نہیں نہیں۔'' اور اپنا سر میری رانوں پر رکھ دیا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے رونا بند کر دیا اور سوکھی سوکھی ہچکیاں لینے لگی۔ پھر ایک دم مجھے اپنے ساتھ زور کے ساتھ بھینچ لیا اور شدت کے ساتھ کانپنے لگی۔ میں نے اسے صوفے پر سے اٹھا کر فرش پر بٹھا دیا اور--- کمرے میں دفعتاً'' روشنی کی لکیریں تیر گئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ ''کون ہے؟'' نوکر کی آواز آئی۔ ''لالٹین لے لیجئے۔'' میں نے کہا: ''اچھا۔'' لیکن اس نے آواز بھینچ کر خوفزدہ لہجے میں کہا: ''نہیں نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا حرج ہے۔ ایک طرف نیچی کر کے رکھ دوں گا۔'' چنانچہ میں نے اٹھ کر لالٹین لی اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اتنی دیر کے بعد روشنی دیکھی تھی۔ اس لئے آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اٹھ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''بھئی اتنا بھی کیا ہے۔ تھوڑی دیر روشنی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں جب تم کہو گی اسے گل کر دیں گے۔''

چنانچہ میں لالٹین ہاتھ ہی میں لئے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ساڑی کا پلو سرکا کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ میں نے کہا۔ ''تم بھی عجیب وغریب لڑکی ہو۔ اپنے دولھے سے بھی پردہ۔''

یہ کہہ کر میں سمجھنے لگا کہ وہ میری دلھن ہے اور میں اس کا دولھا۔ چنانچہ اسی تصور کے تحت میں نے اس سے کہا۔ ''اگر ضد ہی کرنی ہے تو بھئی کر لو--- ہمیں آپ کی ہر ادا قبول ہے۔''

ایک دم زور کا دھماکہ ہوا۔ وہ میرے ساتھ چمٹ گئی۔ کہیں بم پھٹا تھا۔ میں نے اس کو دلاسا دیا۔ ''ڈرو نہیں۔ معمولی بات ہے۔'' --ایک دم مجھے خیال آیا جیسے میں نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھی تھی۔ چنانچہ اس کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا--- میں بیان نہیں کر سکتا میں نے کیا دیکھا--- بہت ہی بھیانک صورت، گال اندر دھنسے ہوئے، جن پر

گاڑھا میک اپ تھپا تھا۔ کتنی جگہوں پر سے اس کی تہہ بارش کی وجہ سے اتری ہوئی تھی اور نیچے سے اصلی جلد نکل آئی تھی جیسے کئی، زخموں پر سے پھاہے اتر گئے ہیں--- خضاب لگے خشک اور بے جان بال جن کی سفید جڑیں دانت دکھا رہی تھیں---اور سب سے عجیب وغریب چیز مومی پھول تھے جو اس نے اس کان سے اس کان تک ماتھے کے ساتھ ساتھ بالوں میں اڑسے ہوئے تھے--- میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا۔ وہ بالکل ساکت کھڑی رہی۔ میرے ہوش وحواس گم ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں سنبھلا تو میں نے لالٹین ایک طرف رکھی اور اس سے کہا 'تم جانا چاہو تو چلی جاؤ!''

اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن جب دیکھا کہ میں اس کا رین کوٹ اور بیگ اٹھا رہا ہوں تو وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اس کی طرف دیکھے بغیر اس کو دے دیں۔ وہ کچھ دیر گردن جھکائے کھڑی رہی۔ پھر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔''

یہ واقعہ سن کر میں نے ''س'' سے پوچھا۔ ''جانتے ہو وہ عورت کون تھی؟''

''س'' نے اس کو بتایا۔'' وہ عورت مشہور آرٹسٹ مس ''م'' تھی۔''

وہ چلاّیا۔ ''مس م؟۔ وہی جس کی بنائی ہوئی تصویروں کی میں اسکول میں کاپی کیا کرتا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''وہی--- جو ایک آرٹ کالج کی پرنسپل تھی، جہاں وہ لڑکیوں کو صرف عورتوں اور پھولوں کی تصویر کشی سکھاتی تھی--- مردوں سے اسے سخت نفرت تھی۔''

یہ سن کر ''س'' کچھ سوچنے لگا۔ مگر ایک دم چونکا۔ ''کہاں ہے آج کل۔''

میں نے مسکرا کر جواب دیا ''آسمان پر''

اس نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

میں نے جواب دیا۔ ''اسی رات کو جب تم نے اسے باہر نکالا اس کی موٹر کا حادثہ ہوا اور وہ مر گئی۔ لیکن اس کے قاتل تم ہو۔ یہ صرف میں جانتا ہوں--- نہیں--- تم دو عورتوں کے قاتل ہو۔ ایک اس عورت کے جس کو سب مشہور آرٹسٹ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ دوسری اس عورت کے جو تمہارے دیوان خانے میں پہلی بار عورت کے قالب سے باہر نکلی تھی اور جس کو صرف تم جانتے ہو۔''

''س'' خاموش رہا۔

ڈاکٹر شروڈکر

بمبئی میں ڈاکٹر شروڈکر کا بہت نام تھا، اس لئے کہ وہ عورتوں کے امراض کا بہترین معالج تھا۔ اس کے ہاتھ میں شفا تھی۔ اس کا شفاخانہ بہت بڑا تھا، ایک عالیشان عمارت کی دو منزلوں میں، جن میں کئی کمرے تھے۔ نچلی منزل کے کمرے متوسط اور نچلے طبقے کی عورتوں کے لئے مخصوص تھے، بالائی منزل کے کمرے امیر عورتوں کے لئے۔

ایک لیبارٹری تھی اور اس کے ساتھ ہی کمپاؤنڈر کا کمرہ۔ ایکسرے کا کمرہ علیحدہ تھا— اس کی ماہانہ آمدن ڈھائی تین ہزار کے قریب ہوگی۔

مریض عورتوں کے کھانے کا انتظام بہت اچھا تھا، جو اس نے ایک پارسن کے سپرد کر رکھا تھا، جو اس کے ایک دوست کی بیوی تھی۔

ڈاکٹر شروڈکر کا یہ چھوٹا سا ہسپتال، میٹرنٹی ہوم بھی تھا— بمبئی کی آبادی کے متعلق آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، کتنی ہوگی وہاں بے شمار سرکاری ہسپتال اور میٹرنٹی ہوم ہیں، لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر شروڈکر کا کلینک بھرا رہتا۔ بعض اوقات تو اسے کئی کیسوں کو مایوس کرنا پڑتا، اس لئے کہ کوئی بیڈ خالی نہیں رہتا تھا۔

اس پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بیویاں اور جوان لڑکیاں اس کے ہسپتال میں چھوڑ آتے تھے، جہاں ان کا بڑی توجہ سے علاج کیا جاتا تھا۔

ڈاکٹر شروڈکر کے ہسپتال میں دس بارہ نرسیں تھیں۔ یہ سب کی سب محنتی اور پرخلوص تھیں۔ مریض عورتوں کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کرتیں— ان نرسوں کا انتخاب ڈاکٹر شروڈکر

نے بڑی چھان بین کے بعد کیا تھا۔ــــ وہ بڑی اور بھدی شکل کی کوئی نرس اپنے ہسپتال میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ جب چار نرسوں نے دفعتاً شادی کرنے کا فیصلہ کیا تو ڈاکٹر بہت پریشان ہوا ــــ جب وہ چاروں چلی گئیں تو اس نے مختلف اخباروں میں اشتہار دیئے کہ اسے نرسوں کی ضرورت ہے۔ کئی آئیں۔ ڈاکٹر شروڈکر نے اُن سے انٹرویو کیا، مگر اسے ان میں کسی کی شکل پسند نہ آئی۔

کسی کا چہرہ ٹیڑھا میڑھا، کسی کا قد انگشتانے بھر کا، کسی کا رنگ خوفناک طور پر کالا، کسی کی ناک گز بھر لمبی ــــ لیکن وہ بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اس نے اور اشتہار اخباروں میں دیئے اور آخر اس نے چار خوش شکل اور نفاست پسند نرسیں چُن ہی لیں۔

اب وہ مطمئن تھا، چنانچہ اس نے پھر دل جمعی سے کام شروع کر دیا۔ مریض عورتیں بھی خوش ہوگئیں، اس لئے کہ چار نرسوں کے چلے جانے سے ان کی خبر گیری اچھی طرح نہیں ہو رہی تھی۔ یہ نئی نرسیں بھی خوش تھیں کہ ڈاکٹر شروڈکر ان سے بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔ اُنہیں وقت پر تنخواہ ملتی تھی۔ دوپہر کا کھانا ہسپتال ہی اُنھیں مہیا کرتا۔ وردی بھی ہسپتال کے ذمے تھی۔

ڈاکٹر شروڈکر کی آمدن چونکہ بہت زیادہ تھی، اس لئے وہ ان چھوٹے موٹے اخراجات سے گھبراتا نہیں تھا۔ شروع شروع میں جب اس نے سرکاری ہسپتال کی ملازمت چھوڑ کر خود اپنا ہسپتال قائم کیا تو اس نے تھوڑی بہت کنجوسی کی، مگر بہت جلد اس نے کُھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔

اس کا ارادہ تھا کہ شادی کرلے، مگر اسے ہسپتال سے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تھی ــــ دِن رات اس کو وہیں رہنا پڑتا۔ بالائی منزل میں اس نے ایک چھوٹا سا کمرہ اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا، جس میں وہ رات کو چند گھنٹے سو جاتا۔ لیکن اکثر اسے جگا دیا جاتا، جب کسی مریض عورت کو اس کی فوری توجہ کی ضرورت ہوتی۔

تمام نرسوں کو اس سے ہمدردی تھی کہ اس نے اپنی نیند، اپنا آرام حرام کر رکھا ہے۔ وہ اکثر اس سے کہتیں:

"ڈاکٹر صاحب، آپ کوئی اسسٹنٹ کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

ڈاکٹر شروڈکر جواب دیتا: "جب کوئی قابل ملے گا تو رکھ لوں گا۔"

وہ کہتیں: "آپ تو اپنی قابلیت کا چاہتے ہیں۔ بھلا وہ کہاں سے مِلے گا؟"

"مل جائے گا۔"

نرسیں یہ سن کر خاموش ہو جاتیں اور الگ جا کر آپس میں باتیں کرتیں: "ڈاکٹر شروڈکر

اپنی صحت خراب کر رہے ہیں۔ کسی دن کہیں کولیپس نہ ہو جائیں۔''

''ہاں ان کی صحت کافی گر چکی ہے...... وزن بھی کم ہو گیا ہے۔''

''کھاتے پیتے بھی بہت کم ہیں۔''

''ہر وقت مصروف جو رہتے ہیں۔''

''اب اُنھیں کون سمجھائے۔''

قریب قریب ہر روز ان کے درمیان اسی قسم کی باتیں ہوتیں ــــــ ان کو ڈاکٹر سے اِس لئے بھی بہت زیادہ ہمدردی تھی کہ وہ بہت شریف النفس انسان تھا۔ اس کے ہسپتال میں سینکڑوں خوب صورت اور جوان عورتیں علاج کے لئے آتی تھیں، مگر اس نے کبھی ان کو بُری نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اپنے کام میں مگن رہتا۔

اصل میں اسے اپنے پیشے سے ایک قسم کا عشق تھا ــــــ وہ اس طرح علاج کرتا تھا، جس طرح کوئی شفقت اور پیار کا ہاتھ کسی کے سر پر پھیرے۔

جب وہ سرکاری ہسپتال میں ملازم تھا تو اس کے آپریشن کرنے کے عمل کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ نشتر نہیں چلاتا، برش سے تصویریں بناتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے کیئے ہوئے آپریشن نوّے فی صد کامیاب رہتے تھے۔ اس کو اِس فن میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اِس کے علاوہ خود اعتمادی بھی تھی، جو اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھی۔

ایک دِن وہ ایک عورت کا، جس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، بڑے غور سے معائنہ کر کے باہر نکلا اور اپنے دفتر میں گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک بڑی حسین لڑکی بیٹھی ہے ــــــ ڈاکٹر شروڈکر ایک لحظے کے لئے ٹھٹک گیا۔ اس نے نسوانی حسن کا ایسا نادر نمونہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ اندر داخل ہوا ــــــ لڑکی نے کرسی پر سے اٹھنا چاہا ــــــ ڈاکٹر نے اس سے کہا: ''بیٹھو بیٹھو۔'' اور یہ کہہ کر وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر پیپر ویٹ پکڑ کر اس کے اندر ہوا کے بُلبلوں کو دیکھتے ہوئے اس لڑکی سے مخاطب ہوا: ''بتاؤ، تم کیسے آئیں؟''

لڑکی نے آنکھیں جھکا کر کہا: ''ایک پرائیویٹ...... بہت ہی پرائیویٹ بات ہے جو میں آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر شروڈکر نے اس کی طرف دیکھا ــــــ اس کی جھکی ہوئی آنکھیں بھی بلا کی خوبصورت دِکھائی دے رہی تھیں ــــــ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا: ''پرائیویٹ بات تم کر لینا......

پہلے اپنا نام بتاؤ۔"

لڑکی نے جواب دیا: "میں...... میں اپنا نام بتانا نہیں چاہتی۔"

ڈاکٹر کی دلچسپی اِس جواب سے بڑھ گئی: "کہاں رہتی ہو؟"

"شولا پور میں...... آج ہی یہاں پہنچی ہوں۔"

ڈاکٹر نے پیپر ویٹ میز پر رکھ دیا: "اتنی دُور سے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا: "میں نے کہا ہے نا کہ مجھے آپ سے ایک پرائیویٹ بات کرنی ہے۔"

اتنے میں ایک نرس اندر داخل ہوئی — لڑکی گھبرا گئی — ڈاکٹر نے اس نرس کو چند ہدایات دیں، جو وہ پوچھنے آئی تھی۔ پھر اس نے نرس سے کہا: "اب تم جا سکتی ہو...... ہاں کسی نوکر سے کہہ دو کہ وہ کمرے کے باہر کھڑا رہے اور کسی کو اندر نہ آنے دے۔"

نرس "جی اچھا" کہہ کر چلی گئی ——— ڈاکٹر نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس حسین لڑکی سے مخاطب ہوا: اب تم اپنی پرائیویٹ بات مجھے بتا سکتی ہو۔"

شولا پور کی لڑکی شدید گھبراہٹ اور اُلجھن محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لفظ آتے، مگر پھر واپس اس کے حلق کے اندر چلے جاتے ——— آخر اس نے ہمت اور جرأت سے کام لیا اور رُک رُک کے صرف اتنا کہا: "مجھ سے...... مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے...... میں گھبرا رہی ہوں۔"

ڈاکٹر شروڈکر سمجھ گیا، لیکن پھر بھی اس نے اس لڑکی سے کہا: "غلطیاں انسان سے ہو ہی جاتی ہیں...... تم سے کیا غلطی ہوئی ہے؟"

لڑکی نے تھوڑے وقفے کے بعد جواب دیا: "وہی...... وہی جو بے سمجھ جوان لڑکیوں سے ہوا کرتی ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا: "میں سمجھ گیا ہوں...... لیکن اب تم کیا چاہتی ہو؟"

لڑکی فوراً اپنے مقصد کی طرف آ گئی: "میں چاہتی ہوں کہ وہ ضائع ہو جائے...... صرف ایک مہینہ ہوا ہے۔"

ڈاکٹر شروڈکر نے کچھ دیر سوچا، پھر بڑی سنجیدگی سے کہا: "یہ جرم ہے...... تم جانتی نہیں ہو۔"

لڑکی کی بھوری آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو اُمنڈ آئے: "تو میں زہر کھا لوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر کو اس پر بڑا ترس آیا — وہ اپنی جوانی کی پہلی لغزش کر چکی تھی پتا نہیں، وہ کیا لمحات تھے کہ اس نے اپنی عصمت کسی مرد کے حوالے کر دی اور اب پچھتا رہی ہے اور اتنی پریشان ہو رہی ہے۔

اس کے پاس اس سے پہلے ایسے کئی کیس آ چکے تھے، مگر اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ جیو ہتیا نہیں کر سکتا؛ یہ بہت بڑا گناہ اور جرم ہے۔

مگر شولا پور کی اُس لڑکی نے اس پر کچھ ایسا جادو کیا کہ وہ اس کی خاطر یہ جرم کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اس کے لئے علیحدہ کمرہ مختص کر دیا۔ کسی نرس کو اس کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے کہ وہ اس لڑکی کے راز کو افشا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اسقاط بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے — جب اس نے دوائیاں وغیرہ دے کر وہ کام کر دیا تو نقاہت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہیں پی سکتی تھی۔

وہ چاہتی تھی کہ جلد گھر واپس چلی جائے، مگر ڈاکٹر اسے کیسے اجازت دے سکتا تھا، جب کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہی نہیں تھی — اس نے مِس للیتا کھٹے کر سے کہا: ”تمہیں کم از کم دو مہینے آرام کرنا پڑے گا...... میں تمہارے باپ کو لکھ دوں گا کہ تم جس سہیلی کے پاس آئی تھیں، وہاں اچانک طور پر بیمار ہو گئی تھیں اور اب میرے ہسپتال میں زیرِ علاج ہو...... تردّد کی کوئی بات نہیں۔“

للیتا مان گئی۔

وہ دو مہینے ڈاکٹر شروڈکر کے زیرِ علاج رہی — جب رُخصت کا وقت آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ گڑبڑ پھر پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے ڈاکٹر شروڈکر کو اِس سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر مسکرایا: ”فکر کی کوئی بات نہیں...... میں تم سے آج ہی شادی کر لوں گا۔“

راجو

سن اِکتیس کے شروع ہونے میں صرف رات کے چند برفائے ہوئے گھنٹے باقی تھے۔

وہ لحاف میں سردی کی شدّت کے باعث کانپ رہا تھا۔ وہ پتلون اور کوٹ سمیت لیٹا ہوا تھا لیکن اِس کے باوجود سردی کی لہریں اس کی ہڈیوں تک پہنچ رہی تھیں۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنے کمرے کی سبز روشنی میں، جو سردی میں اضافہ کر رہی تھی، زور زور سے ٹہلنا شروع کر دیا کہ اُس کا دورانِ خون تیز ہو جائے۔

تھوڑی دیر یوں چلنے پھرنے کے بعد جب اس کے جسم کے اندر تھوڑی سی حرارت پیدا ہو گئی تو وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سُلگا کر اپنے دماغ کو ٹٹولنے لگا ـــــ اس کا دماغ چونکہ بالکل خالی تھا، اس لئے اس کی قوّتِ سامعہ بہت تیز ہو گئی تھی۔

کمرے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں مگر وہ باہر گلی میں ہوا کی مدھم سے مدھم گنگناہٹ بھی بڑی آسانی سے سُن رہا تھا۔

اُسی گنگناہٹ میں اسے انسانی آوازیں سُنائی دیں ـــــ ایک دبی دبی سی چیخ دسمبر کی آخری رات کی خاموشی میں چابک کے اوّل کی طرح اُبھری اور پھر کسی کی التجائیہ آواز لرزی۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کھڑکی کی درز میں سے باہر کی طرف دیکھا۔

وہی، وہی لڑکی، سوداگروں کی نوکرانی میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی، صرف ایک سفید بنیان پہنے ـــ لالٹین کی روشنی میں یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے بدن پر برف کی ایک پتلی سی تہہ جم گئی ہے۔

بنیان کے نیچے لڑکی کی بدنما چھاتیاں ناریلوں کے مانند لٹک رہی تھیں اور وہ اِس انداز میں کھڑی تھی، گویا ابھی ابھی کشتی سے فارغ ہوئی ہے۔

لڑکی کو ایسی حالت میں دیکھ کر اس کے صناعانہ جذبات کو دھچکا سا لگا۔

اتنے میں کسی مرد کی پچکی بھینچی بھینچی سی آواز اس کو سنائی دی: ''خدا کے لئے اندر چلی آؤ--- کوئی دیکھ لے گا تو آفت ہی آجائے گی!'' آواز سوداگر بچے کی تھی کہ وہ پہچانتا تھا۔

وحشی بلّی کی طرح لڑکی نے غرّا کر جواب دیا۔ ''میں نہیں آؤں گی--- بس ایک بار جو کہہ دیا کہ نہیں آؤں گی۔''

سوداگر بچے نے التجاء کے طور پر لڑکی سے کہا— ''خدا کے لئے اُونچا نہ بولو راجو، کوئی سن لے گا۔''

''تو اس کا نام راجو ہے۔'' اس نے من ہی من میں کہا۔

راجو نے اپنی لنڈوری چٹیا کو جھٹکا دے کر سوداگر بچے سے کہا: ''سن لے، ساری دنیا سن لے، خدا کرے ساری دنیا سن لے...... اگر تم مجھے اپنے کمرے کے اندر آنے کے لئے کہو گے تو میں خود محلّے بھر کو جگا کر سب کچھ کہہ دوں گی۔''

راجو اسے نظر آرہی تھی مگر سوداگر بچہ، جس سے وہ مخاطب تھی، اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لے کر پھر کھڑکی کی بڑی درز سے راجو کو دیکھا، اور اس کے بدن پر جھرجھری سی طاری ہوگئی——— اگر راجو ساری کی ساری ننگی ہوتی تو شاید اس کے صناعانہ جذبات کو ٹھیس نہ پہنچتی۔ راجو کے جسم کے جو حصے ننگے تھے، اس کے جسم کے مستور حصوں کو عریاں کر رہے تھے۔

راجو میونسپیلٹی کی لالٹین کے نیچے کھڑی تھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ عورت کے متعلق اس کے جذبات اپنے کپڑے اُتار رہے ہیں۔

راجو کی غیر متناسب بانہیں، جو کاندھوں تک ننگی تھیں، نفرت انگیز طور پر لٹک رہی تھیں؛ مردانہ بنیان اور گول گلے میں سے اس کی نیم پختہ ڈبل روٹی ایسی موٹی اور نرم چھاتیاں کچھ اس انداز سے باہر جھانک رہی تھیں گویا سبزی ترکاری کی ٹوٹی ہوئی ٹوکری میں سے گوشت کے ٹکڑے دکھائی دے رہے ہوں؛ حد سے زیادہ استعمال شدہ گھسی ہوئی پتلی بنیان کا نچلا گھیرا خود بخود اُوپر کو اُٹھ گیا تھا اور راجو کی ناف کا گڈھا اُس کے خمیرے آٹے ایسے پھولے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی نے انگلی کھبو دی ہو۔

وہ نظارہ دیکھ کر اس کے دماغ کا ذائقہ خراب ہوگیا——اس نے چاہا کہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بستر پر لیٹ جائے اور سب کچھ بھول بھال کر سو جائے، لیکن جانے کیوں وہ درز پر آنکھ جمائے کھڑا رہا۔

راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت پیدا ہوگئی تھی اور شاید وہ اسی نفرت کی وجہ کے راجو میں دلچسپی لے رہا تھا۔

سب سے چھوٹے سوداگر بچے نے، جس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ ہوگی، ایک بار پھر التجایئہ لہجے میں راجو سے کہا: ''راجو، خدا کے لئے اندر چلی آؤ...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی تمہیں نہیں ستاؤں گا...... لو اب من جاؤ...... تمہاری بغل میں وکیلوں کا مکان ہے: ان میں سے کسی نے دیکھ یا سن لیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔''

راجو خاموش رہی، پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی: ''مجھے میرے کپڑے لا دو...... بس اب میں تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی...... تنگ آ گئی ہوں...... میں کل سے وکیلوں کے ہاں نوکری کرلوں گی...... اب اگر تم نے مجھ سے کچھ اور کہا تو خدا کی قسم، شور مچانا شروع کر دوں گی...... چپ چاپ میرے کپڑے لا دو۔''

سوداگر بچے نے کہا: ''لیکن تم رات کہاں کاٹو گی؟''

راجو نے جواب دیا: ''جہنم میں...... تمہیں اس سے کیا...... جاؤ، اپنی بیوی کی بغل گرم کرو، میں کہیں نہ کہیں سو جاؤں گی۔'' راجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے——وہ سچ مچ رو رہی تھی۔

درز پر سے آنکھ ہٹا کر وہ پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔

راجو کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اسے عجیب قسم کا صدمہ ہوا تھا: اس صدمے کے ساتھ وہ نفرت بھی لپٹی ہوئی تھی جو راجو کو اس حالت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی——مگر غایت درجہ نرم دل ہونے کے باعث وہ پگھل سا گیا۔ راجو کی کھلاڑی آنکھوں میں، جو شیشے کے مرتبان میں چمکدار مچھلیوں کی طرح سدا متحرک رہتی تھیں، آنسو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ انھیں تھپکا کر دلاسا دے۔

راجو کی جوانی کے چار قیمتی برس سوداگر بھائیوں نے معمولی چٹائی کی طرح استعمال کئے تھے۔ اِن برسوں میں تینوں سوداگر بھائیوں کے نقشِ قدم کچھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا خوف نہیں رہا تھا کہ کوئی ان کے پیروں کے نشان پہچان لے گا۔ اور راجو کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہ اس نے اپنے قدموں کے نشان دیکھے تھے، نہ دوسروں

کے۔ راجو کو تو بس چلتے جانے کی دُھن تھی، کسی بھی طرف۔

پر اب شاید راجو نے مڑ کے دیکھا تھا ــــ مڑ کے راجو نے کیا دیکھا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ــــ وہ نہیں جانتا تھا۔

باہر سن تیس کی آخری رات دم توڑ رہی تھی اور اندر کمرے میں اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

O

کیا راجو سوداگر بھائیوں کے مکان کے اندر چلی گئی ہے؟

کیا وہ سب سے چھوٹے سوداگر بچّے کا کہا مان گئی ہے؟

مگر وہ جھگڑی کس بات پر ہے؟

ضرور اس کے اور سوداگر بچّے کے درمیان، جس کا نام محمود ہے، کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے ــــ جبھی تو وہ دسمبر کی خون منجمد کر دینے والی آخری رات میں صرف ایک بنیان پہنے گھر سے باہر نکل آئی ہے اور واپس اندر جانے کا نام تک نہیں لے رہی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ اسے راجو کے کانپتے ہوئے نتھنے نظر آ رہے ہیں۔

وہ جانتا تھا کہ راجو کو دکھی دیکھ کر اس کے ایک نامعلوم جذبے کو تسکین ملی ہے، لیکن اس کے دل میں رحم کے جذبات بھی پیدا ہوئے ہیں۔

کسی عورت سے اس نے کبھی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا؛ شاید اسی لئے وہ راجو کو دکھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکے۔

اسے یقین تھا کہ اگر وہ راجو کے قریب ہونا چاہے گا تو وہ جنگلی گھوڑی کی طرح بدکے گی نہیں۔

راجو غلاف چڑھی عورت نہیں تھی؛ وہ جیسی بھی تھی، دور سے نظر آ جاتی تھی؛ اس کی بھدی اور موٹی ہنسی جو اکثر اس کے مٹ میلے ہونٹوں پر بچّوں کے ٹوٹے ہوئے گھروندے کے مانند نظر آتی تھی، اصلی ہنسی تھی ــــ اور اب اس کی بھنورے جیسی متحرک آنکھوں نے آنسو اُگل دیے تھے تو ان میں کوئی مصنوعی پن نہیں رہا تھا۔

راجو کو وہ، اس کا نام جانے بنا، ایک مدّت سے جانتا تھا ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے راجو کے چہرے کے تمام خطوط تبدیل ہوئے تھے اور وہ غیر محسوس طریق پر لڑکی سے عورت بننے کی طرف متوجہ ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ تین سوداگر بھائیوں کو ہجوم نہیں سمجھتی تھی۔

اسے یہ ہجوم پسند نہیں تھا، اس لئے کہ وہ ایک عورت کے ساتھ صرف ایک مرد منسلک دیکھنے کا قائل تھا ــــ اور یوں اسے راجو کے معاملے میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے درمیان

رُک جانا پڑتا تھا۔

○

سن اکتیس کی پہلی صبح وہ آئی۔

وہ لحاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا اور جاگ رہا تھا۔

اس نے کمرہ صاف کیے جانے کی آواز سنی تو سمجھا کہ جمعدار جلدی آ گیا ہے —— اس نے لحاف کے اندر ہی سے کہا: ''جمعدار، گرد مت اُڑانا۔''

ایک نسوانی آواز اس کو سنائی دی: ''جی میں ...... جی میں تو ......''

اس نے لحاف الٹ دیا —— راجو سامنے کھڑی تھی۔

وہ بہت متحیر ہوا —— چند لحات وہ راجو کو دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا: ''تم یہاں کیسے آ گئی ہو؟''

راجو نے جھاڑو اپنے کاندھے پر رکھا اور جواب دیا: ''میں آج صبح ہی یہاں آئی ہوں ...... سوداگروں کی نوکری میں نے چھوڑ دی ہے۔''

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ آخر اس نے اتنا کہا: ''اچھا کیا ......! اب کیا تم نے ہمارے ہاں ملازمت اختیار کر لی ہے؟''

''جی ہاں۔'' راجو نے مختصر سا جواب دیا۔

یکا یک اس نے محسوس کیا کہ اس کو راجو سے سخت نفرت ہے اور اس کو بڑی الجھن محسوس ہوئی۔

رات کا تماشا اس کی آنکھوں کے سامنے تھا: ''مجھے اس سے نفرت ہے، اس قدر نفرت کہ میں چاہتا ہوں، یہ میری نظروں کے سامنے نہ آئے ...... میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں اس کا کسی قسم کا دخل ہو ......''

وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا —— حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ اس کی والدہ بہت رحم دل تھیں اور انھیں ایک نوکرانی کی ضرورت تھی اور انھوں نے راجو کو ملازم رکھ لیا تھا۔

راجو آتی —— صبح ناشتہ لے کر آتی؛ پھر شیو کا سامان لے کر آتی؛ دوپہر کا کھانا پیش کرتی۔

اس کو راجو کی سب باتیں بہت ناگوار گزرتیں —— وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجو اس کے لئے وہ سب کرے۔

ایک دن اس نے تنگ آ کر راجو سے کہا: ''دیکھو راجو، مجھے تمہاری ہمدردیاں پسند نہیں ...... میں اپنا کام خود کر سکتا ہوں ...... تم مہربانی کر کے تکلیف نہ کیا کرو۔''

راجو نے بڑی متانت سے کہا: ''سرکار، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی...... میں تو آپ کی باندی ہوں۔''

وہ جھینپ سا گیا: ''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے --- تم نوکرانی ہو، بس اس بات کا خیال رکھو۔''

راجو نے تپائی کا کپڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا: ''جی مجھے ہر چیز کا خیال ہے...... مجھے اس بات کا بھی خیال ہے کہ آپ مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔''

وہ لٹ پٹ گیا: ''میں...... میں تمہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا، یہ تم نے...... یہ تم نے کیسے جانا؟''

راجو مسکرائی: ''حضور، آپ امیر آدمی ہیں...... آپ کو ہم غریبوں کے دکھ درد کا کوئی احساس نہیں ہو سکتا۔''

اس کو راجو سے اور زیادہ نفرت ہو گئی —— وہ سمجھنے لگا کہ وہ لڑکی، جو اس کے گھر میں اس کی والدہ کی نرم طبیعت کی وجہ سے آ گئی ہے، بہت واہیات ہے۔

اور راجو تھی کہ بڑی باقاعدگی سے گھر کا کام کرتی کہ نقص نکالنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

جب اس کی شادی کا سوال اٹھا تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا —— اس نے اپنے والدین سے صاف لفظوں میں کہہ دیا: ''مجھے یہ جھنجھٹ ابھی نہیں چاہئے۔''

اس کے والدین نے بہت زور دیا کہ وہ شادی کر لے، مگر وہ نہ مانا —— اسے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔

ایک دن وہ گھر سے غائب ہو گیا —— راجو بھی۔

دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ میاں بیوی بن چکے ہیں۔

سرکنڈوں کے پیچھے

کون سا شہر تھا، اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے اور مجھے بتا نے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جو اس کہانی سے متعلق ہے، پشاور کے مضافات میں تھی۔ سرحد کے قریب اور جہاں وہ عورت رہتی تھی، اس کا گھر جھونپڑا نما تھا— سرکنڈوں کے پیچھے۔

گھنی باڑھ تھی، جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا، کچی مٹی کا بنا ہوا۔ چونکہ یہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لئے سرکنڈوں کے پیچھے چھپ سا گیا تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سرکنڈے بالکل سوکھے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے تھے کہ ایک دبیز پردہ بن گئے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پیوست کئے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہر حال، کہنا یہ ہے کہ وہ آہنی قسم کے پردہ پوش تھے۔

مکان کہہ لیجئے یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھڑیاں تھیں۔ مگر صاف ستھری۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا۔ پچھلے کمرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پلنگ تھا۔ اس کے ساتھ ایک طاقچہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیا رات بھر جلتا رہتا تھا—— مگر یہ طاقچہ بھی صاف ستھرا رہتا تھا۔ اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔

اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتا دوں جو اس مختصر سے مکان میں جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا رہتا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی۔ ایک یتیم لڑکی تھی جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اس کی سگی بیٹی تھی ــــ حقیقت جو کچھ بھی ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود بخود کوئی نہ کوئی رائے قائم کر لیجئے گا۔

دیکھئے، میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا ــــــ بات اصل میں یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجئے، سکینہ مہتاب، گلشن یا کوئی اور۔ آخر نام میں کیا رکھا ہے۔ لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔

یہ سردار، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت ہوگی۔ اس کے سرخ و سفید گالوں پر گو کسی قدر جھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی بیٹی، معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی تھی یا نہیں، شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔ اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ وہ فاحشہ ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کما رہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس لڑکی کو جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔

اصل میں اس نے آبادی سے دور ایک ایسے مقام پر پرورش پائی تھی کہ اس کو صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر ــــــ نواڑی پلنگ پر متعارف کرایا تو غالباً اس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کسبیانہ زندگی سے مانوس ہو گئی تھی اور وہ مرد جو دور دور سے چل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے ساتھ اس بڑے نواڑی پلنگ پر لیٹتے تھے، اس نے سمجھا تھا کہ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔

یوں تو وہ ہر لحاظ سے ایک فاحشہ عورت تھی ان معنوں میں جن میں ہماری شریف اور مطہر عورتیں ایسی عورتوں کو دیکھتی ہیں، مگر سچ پوچھئے تو اس کو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے ــــ وہ اس کے متعلق غور بھی کیسے کر سکتی تھی جب کہ اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے۔ اور وہ اس مرد کی ہر آسائش اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی کوئی ننھی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کو شہر کے لوگوں کے تکلفات کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ قطعاً نہیں جانتی تھی کہ جو مرد اس کے پاس موٹروں میں آتے ہیں، صبح سویرے اپنے دانت برش کے ساتھ صاف کرنے کے عادی ہیں اور آنکھیں کھول کر سب سے پہلے بستر میں چائے کی ایک پیالی پیتے ہیں، پھر رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں۔ مگر اس نے آہستہ آہستہ بڑے الہڑ طریقے پر ان مردوں کی عادات سے کچھ واقفیت حاصل کر لی تھی۔ پر اسے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ سب مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے تھے۔ کوئی صبح سویرے اٹھ کر سگریٹ مانگتا تھا، کوئی چائے، اور بعض ایسے بھی ہوتے جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات جاگتے رہتے اور صبح موٹر میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔

سردار بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر، یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا کہ وہ اپنے گاہکوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لئے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر کھاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی —— مثال کے طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث یکدم خراب ہو جائے، تو وہ غنودگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلا دے یا کوشش کرے کہ وہ نمک ملا گرم گرم پانی پلا کر قے کرا دے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلا دے۔

سردار اس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جونہی کوئی گاہک آتا، وہ اس سے نواب کی فیس پہلے وصول کر کے اپنے نیفے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دے کر، کہ تم آرام سے جھولے جھولو، افیم کی ایک گولی ڈبیا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔

جو روپیہ آتا، اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تحائف وصول ہوتے، وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولت مند ہوتے، اس لئے وہ بڑھیا کپڑا پہنتی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔

وہ خوش تھی —— مٹی سے لپے پتے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ اور خوشگوار زندگی بسر کر رہی تھی —— ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لا دیئے تھے۔ فرصت کے اوقات میں وہ ان کو بجا بجا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا۔ مگر شاید وہ اس سے بے خبر تھی —— سچ پوچھئے تو اس کو کسی بات کی بھی خبر نہیں تھی اور نہ اس کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔ جس راستے پر وہ ڈال دی گئی تھی، اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔ بڑی بے خبری کے عالم میں۔

سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا کیسی ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی سوائے اس

۔کے کہ ایک کچی سڑک ہے جس پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک موٹر دھول اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ ہارن بجتا ہے۔ اس کی ماں یا جو کوئی بھی وہ تھی، کھٹیا سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر موٹر والے سے کہتی ہے کہ موٹر ذرا دور کھڑی کر کے اندر آ جائے۔ اور وہ اندر آ جاتا ہے اور نواڑی پلنگ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہی پانچ چھ ہوں گے۔ مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا باہم تصادم نہ ہو۔ بڑی ہوشیار عورت تھی ـــــ وہ ہر گاہک کے لئے خاص دن مقرر کر دیتی، اور ایسے سلیقے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔

اس کے علاوہ ضرورت کے وقت وہ اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب ماں نہ بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی، ان میں اس کا ماں بن جانا یقینی تھا۔ مگر سردار دو ڈھائی برس سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدرتی خطرے سے نبٹ رہی تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دو ڈھائی برس سے بڑے ہموار طریقے پر چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سردار تھی اور اس کی بیٹی نواب، یا جو کوئی بھی وہ تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے، ایک دن مٹی کے اس مکان میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ ایک بہت بڑی موٹر جو غالباً ڈوج تھی وہاں آ کے رکی۔ ہارن بجا۔ سردار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنبی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اجنبی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موٹر دور کھڑی کر کے وہ اترا اور سیدھا ان کے گھر میں گھس گیا جیسے برسوں کا آنے جانے والا ہے۔

سردار بہت سٹ پٹائی، لیکن دروازے کے دہلیز پر نواب نے اس اجنبی کا بڑی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں نواڑی پلنگ تھا۔ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سردار آ گئی ـــــ ہوشیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کسی دولت مند گھرانے کا آدمی ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے۔ اس نے اندر کوٹھڑی میں داخل ہو کر سلام کیا اور پوچھا: ”آپ کو ادھر کا راستہ کس نے بتایا؟“

اجنبی مسکرایا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں میں اپنی انگلی چبھو کر کہا: ”اس نے؟“

نواب تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا: ”ہائیں ـــــ میں تو کبھی تم

سے ملی بھی نہیں۔''

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی: ''ہم تو کئی بار تم سے مل چکے ہیں''

نواب نے پوچھا: ''کہاں —— کب؟'' حیرت کے عالم میں اس کا چھوٹا سا منہ کچھ اس طور پر وا ہوا کہ اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا موجب ہو گیا۔

اجنبی نے اس کا گدگدا ہاتھ پکڑ لیا اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں —— اپنی ماں سے پوچھو۔''

نواب نے بڑے بھول پن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں آتے ہیں، ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہو گا اور سارا اتا پتا بتا دیا ہو گا چنانچہ اس نے نواب سے کہا: ''میں بتا دوں گی تمہیں۔''

اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھٹیا پر بیٹھ کر اس نے ڈبیا میں سے افیم کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے گڑبڑ نہیں کرے گا۔

وثوق سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اغلب یہی ہے کہ اجنبی جس کا نام ہیبت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رئیس تھا، نواب کے الہڑ پن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا: ''خان صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے —— کیا آپ اتنا روپیہ دے سکیں گے کہ..........''

ہیبت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سرکنڈوں کے اس پار چلا گیا۔

نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس دیر تک اپنی بجی ہوئی انگلی کو دیکھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چونکی اور سرکنڈوں کے پاس آئی، مگر اب گرد و غبار کے سوا سڑک پر کچھ بھی نہیں تھا۔

سردار نوٹوں کی گڈی اٹھا کر انہیں گن چکی تھی۔ ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے دو ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلوار کے نیفے میں بڑی صفائی سے اڑسے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھٹیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی

نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔

نواب بہت خوش تھی۔ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس میں ہیرے کی انگوٹھی پڑی تھی ——— تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطرہ ہے، اس لئے اس نے یہ دھندا بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاصا دولت مند تھا، بے نیل مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہیبت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے افیم کھا کر پینک کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر ٹرخا دے گی کہ پولیس والے اس کے پیچھے ہیں...... اور وہ یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔

ہیبت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو گاہکوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔

وہ اسی شان سے آیا جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔ سردار نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ نواب اسے ——— بلکہ یوں کہئے کہ ہیبت خان اسے اس کوٹھری میں لے گیا جہاں نواڑی پلنگ تھا۔ اب کی سردار اندر نہ آئی اور اپنی کھٹیا پر افیم کی گولی کھا کر اونگھتی رہی۔

ہیبت خان بہت محظوظ ہوا۔ اس کو نواب کا الھڑ پن اور بھی زیادہ پسند آیا۔ وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلتروں سے قطعاً ناواقف تھی۔ اس میں وہ گھریلو پن بھی نہیں تھا جو عام عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو خود اس کی اپنی تھی۔ دوسروں سے مختلف۔ وہ بستر میں اس کے ساتھ اس طرح لیٹتی تھی جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔ اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈالتا ہے، اس کے بال نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔

ہیبت خان کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے لئے عورت کی یہ قسم بالکل نرالی، دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔ وہ اب ہفتے میں دو بار آنے لگا تھا۔ نواب اس کے لئے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔

سردار خوش تھی کہ اس کے نیفے میں اڑسنے کے لئے کافی نوٹ مل جاتے ہیں ——— لیکن نواب اپنے الھڑ پن کے باوجود بعض اوقات سوچتی تھی کہ ہیبت خان ڈرا ڈرا سا کیوں رہتا ہے۔ اگر کچی سڑک پر سے، سرکنڈوں کے اس پار کوئی لاری یا موٹر گزرتی ہے تو وہ کیوں سہم جاتا ہے۔ کیوں اس سے الگ ہو کر باہر جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔

ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری ہیبت خان اور نواب دونوں ایک دوسرے سے گھتے ہوئے سو رہے تھے کہ ایک دم ہیبت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نواب کی نیند بڑی ہلکی تھی وہ کانپا تو وہ سر سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آگیا ہے۔ چیخ کر اس نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

ہیبت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔ اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر اس سے کہا "کوئی بات نہیں ــــ میں ــــ میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا۔"

لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آرہی تھی۔

نواب نے اس سے کہا: "نہیں خان ــــ کوئی اور بات ہے۔ جب بھی کوئی موٹر یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے، تمہاری یہی حالت ہوتی ہے۔"

ہیبت خان کی شاید یہ دکھتی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنا مردانہ وقار قائم رکھنے کے لئے بڑے تیز لہجے میں کہا: "بکتی ہو تم ــــ موٹروں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟"

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ ہیبت خان کے تیز لہجے سے اس کے ٹھیس لگی اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ ہیبت خان نے جب اس کو چپ کرایا تو وہ اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین حظ سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب کے جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

ہیبت خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ خوبصورت تھا۔ اس کی بانہوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی۔ اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ یوں کہیئے کہ وہ شئے جو محبت ہوتی ہے، اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔ وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر درد بھرے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔ مگر اس کو اس بات کی بڑی الجھن تھی کہ ہیبت خان موٹروں کی آمد و رفت سے کیوں گھبراتا ہے۔

مہینوں گزر گئے۔ نواب کی سپردگی اور اس کے التفات میں اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب ہیبت خان چند گھنٹوں کے لئے آتا اور افراتفری کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔ نواب محسوس کر سکتی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ ہیبت خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا، مگر وہ گول کر گیا۔ ایک دن صبح

سویرے اس کی ڈوج سرکنڈوں کے پار رکی۔ نواب سو رہی تھی۔ ہارن بجا تو چونک کر اٹھی۔ آنکھیں ملتی ملتی باہر آئی۔ اس وقت ہیبت خان اپنی موٹر دور کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر اندر اس کمرے میں لے گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا۔

دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں ــــــ معلوم نہیں نواب کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کی: "خان ــــ مجھے سونے کے کڑے لا دو۔"

ہیبت خان نے اس کی موٹی موٹی گوشت بھری سرخ و سفید کلائیوں کو کئی مرتبہ چوما اور کہا: "کل ہی آ جائیں گے۔ تمہارے لئے تو میری جان حاضر ہے۔"

نواب نے ایک ادا کے ساتھ، مگر اپنے مخصوص الہڑ انداز میں کہا: "خان صاحب ــــ جانے دیجئے ــــــ جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔"

ہیبت خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا ــــــ اور بڑا پر لطف وقت گزار کے چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود پہنائے گا۔

نواب خوش تھی۔ اس رات وہ دیر تک مسرّت بھرے ریکارڈ بجا بجا کر اس چھوٹی سی کوٹھری میں ناچتی رہی جس میں نواڑی پلنگ تھا ــــــ سردار بھی خوش تھی۔ اس رات اس نے پھر اپنی ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی اور اسے نگل کر سو گئی۔

دوسرے دن نواب اور زیادہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے والے ہیں اور ہیبت خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔ وہ سارا دن منتظر رہی پر وہ نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید موٹر خراب ہو گئی ہو ــــــ شاید رات ہی کو آ جائے۔ مگر وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہیبت خان نہ آیا۔ اس کے دل کو، جو بہت نازک تھا، بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھی، بار بار کہا "دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر کے پھر گیا ہے" لیکن پھر وہ سوچتی اور کہتی "ایسا نہ ہو، کچھ ہو گیا ہو" اور وہ سہم سی جاتی۔

کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔ موٹر کا حادثہ، اچانک بیماری، کسی ڈاکو کا حملہ ــــــ لیکن بار بار اس کو لاریوں اور موٹروں کی آوازوں کا خیال آتا تھا جن کو سن کر ہیبت خان ہمیشہ بوکھلا جاتا تھا ــــــ وہ اس کے متعلق پہروں سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاہک بھی نہ آیا، اس لئے کہ سردار ان سب کو منع کر چکی تھی۔ تین چار لاریاں اور دو موٹریں البتہ اس کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی

گزریں۔نواب کا ہر بار یہی جی چاہا کہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے جائے اور ان کو آگ لگا دے۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہیبت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں، مگر پھر سوچتی کہ موٹریں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہوسکتی ہیں، اور اپنی کم عقلی پر ہنستی۔

لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہیبت خان جیسا تنومند مردان کی آواز سن کر سہم کیوں جاتا ہے۔اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی ہوئی کوئی دلیل جھٹلا نہیں سکتی تھی۔اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموم ہو جاتی اور گراموفون پر درد بھرے ریکارڈ لگا کر سننا شروع کر دیتی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ایک ہفتے کے بعد دوپہر کو جب نواب اور سردار کھانا کھا کر فارغ ہو چکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔دونوں یہ آواز سن کر چونکیں کیونکہ یہ ہیبت خان کی ڈوج کے ہارن کی آواز نہیں تھی——سردار باہر لپکی کہ دیکھے کون ہے، پرانا آدمی ہو تو اسے ٹرخا دے۔مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موٹر میں ہیبت خان بیٹھا ہے۔پچھلی نشست پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔

ہیبت خان نے موٹر کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست سے وہ عورت——دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے۔سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔

عورت کے لئے تو ہیبت خان اتنی دور سے چل کر یہاں آتا ہے، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے، جوان ہے، قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہیبت خان اس خوبصورت عورت کے ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان میں داخل ہو گیا۔وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

جب وہ اندر گئی تو ہیبت خان، نواب اور وہ عورت تینوں نواڑی پلنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی——عجیب قسم کی خاموشی۔زیوروں سے لدی پھندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔

سردار دہلیز کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔اس کے قدموں کی آہٹ سن کر جب ہیبت خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا——ہیبت خان نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

اس عورت کی ٹانگ ہلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی: ''ہم آئے ہیں۔

کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔''

سردار نے سرتاپا مہمان نواز بن کر کہا: ''جو تم کہو، ابھی تیار ہو جاتا ہے۔''

اس عورت نے جس کے خدوخال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑلے کی عورت ہے، سردار سے کہا: ''تو چلو تم باورچی خانے میں ——— چولہا سلگاؤ ——— بڑی دیگچی ہے گھر میں؟''

''ہے!'' سردار نے اپنا وزنی سر ہلایا۔

''تو جاؤ اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔'' وہ عورت پلنگ پر سے اٹھی اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔

سردار نے معذرت بھرے لہجے میں اس سے کہا: ''گوشت وغیرہ تو یہاں نہیں ملے گا۔''

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی ''مل جائے گا۔ تم سے جو کہا ہے، وہ کرو ——— اور دیکھو آگ کافی ہو۔''

سردار یہ احکام لے کر چلی گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے مخاطب ہوئی:

''نواب! ہم تمہارے لئے سونے کے کڑے لے کر آئے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا وینٹی بیگ کھولا اور اس میں سے باریک سرخ کاغذ میں لپٹے ہوئے کڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔

نواب اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ہیبت خان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے کڑوں کو ایک نظر دیکھا اور اس سے بڑی نرم و نازک مگر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: ''خان! یہ کون ہے؟''

اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

وہ عورت کڑوں سے کھیلتے ہوئے بولی: ''میں کون ہوں ——— میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔'' اور یہ کہہ کر اس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جو اس کے اس جواب پر سکڑ سا گیا تھا۔ پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی: ''میرا نام ہلاکت ہے۔''

نواب کچھ نہ سمجھی۔ مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھا رہی تھی جو یقیناً خوبصورت تھیں مگر بڑے خوفناک طور پر کھلی۔ ان میں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اور اس نے سمٹی ہوئی، سہمی ہوئی نواب کی کلائیاں پکڑیں اور ان میں کڑے ڈالنے لگی۔ لیکن اس نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان سے مخاطب ہوئی: ''تم جاؤ ہیبت خان ——— میں اسے اچھی طرح سجا بنا کر تمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔''

ہیبت خان مبہوت تھا۔ جب وہ نہ اٹھا تو وہ عورت جس نے اپنا نام ہلاکت بتایا تھا، ذرا

تیزی سے بولی۔ "جاؤ۔۔۔۔۔۔تم نے سنا نہیں؟"

ہیبت خان، نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ بہت مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔

مکان کے باہر جو برآمدہ سا تھا، اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا باورچی خانہ تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سلگا چکی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی اور سرکنڈوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا۔۔۔۔۔۔اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔

جب اس کو دور سے ایک لاری آتی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی دھول اڑی کہ وہ اس میں غائب ہو گیا۔ اس نے آوازیں دیں، مگر گرد کے باعث اس کا حلق اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آواز نکال سکے۔

گرد و غبار کم ہوا تو ہیبت خان نیم مردہ تھا۔۔۔۔۔۔اس نے چاہا کہ سرکنڈوں کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں نواب کے الہڑ پہلو میں گزاری تھیں، مگر وہ نہ جا سکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔

وہ بہت دیر تک کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ آئی تھی اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے، صرف اس بنا پر کہ بہت دیر ہوئی وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے گیا تھا جو اس کا لنگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پرسی ان دونوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہو گئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا، اور اس عورت نے اس کو ایسے تحکم سے اندر بلا کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہے۔

ہیبت خان عورت کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ جب شاہینہ نے اس سے اپنے عجیب و غریب تحکم بھرے التفات کا اظہار کیا تو اس کے لئے یہی بہت بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی، مگر اسے اس دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لئے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی تھا۔

بہت دیر تک وہ کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے برآمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے میں سردار کو کچھ

بھونتے ہوئے دیکھا اندر اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ کچے فرش پر اس کو سب سے پہلے خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازہ کے پٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا: "میں نے تمہاری نواب کو سجا بنا دیا ہے!"

ہیبت خان نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے کسی قدر تر کر کے اس سے پوچھا: "کہاں ہے؟"

شاہینہ نے جواب دیا: "کچھ تو اس پلنگ پر ہے ـــــ لیکن اس کا بہترین حصہ باورچی خانے میں ہے۔"

ہیبت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر ہیبت طاری ہوگئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں اور...... اور ایک تیز چھری بھی پڑی ہے۔ اور نواڑی پلنگ پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آلود چادر پڑی ہے۔

شاہینہ نے مسکرا کر کہا: "چادر اٹھا کر دکھاؤں ـــــ تمہاری بنی بنی نواب ہے ـــــ میں نے اپنے ہاتھوں سے سنگھار کیا ہے ـــــ لیکن تم پہلے کھانا کھالو۔ بہت بھوک لگی ہوگی تمہیں۔ سردار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں۔

ہیبت خان کے پاؤں لڑکھڑائے ـــــ زور سے چلّایا "شاہینہ تم نے یہ کیا کیا!"

شاہینہ مسکرائی: "جانِ من! یہ پہلی مرتبہ نہیں ـــــ دوسری مرتبہ ہے۔ میرا خاوند، اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوّوں کو کھلایا تھا ـــــ تم سے مجھے پیار ہے، اس لئے میں نے تمہارے بجائے ...."

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پلنگ پر سے خون آلود چادر ہٹادی ـــــ ہیبت خان کی چیخ اس کے حلق کے اندر ہی پھنسی رہی، اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کار چلا رہی ہے اور وہ غیر علاقے میں ہیں۔

سوکینڈل پاور کا بلب

وہ چوک میں قیصر پارک کے باہر جہاں چند تانگے کھڑے رہتے ہیں۔ بجلی کے کھمبے کے ساتھ خاموش کھڑا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے!

یہی پارک جو صرف تدو برس پہلے اتنی پُر رونق جگہ تھی اب اُجڑی اُجڑی دکھائی دیتی تھی۔ جہاں پہلے عورت اور مرد شوخ و شنگ فیشن کے لباسوں میں چلتے پھرتے تھے۔ وہاں اب بے حد میلے کچیلے کپڑوں میں لوگ اِدھر اُدھر بے مقصد پھر رہے تھے۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی مگر اس میں وہ رنگ نہیں تھا جو ایک میلے ٹھیلے کا ہوا کرتا تھا۔ آس پاس کی سیمنٹ سے بنی ہوئی بلڈنگیں اپنا روپ کھو چکی تھیں۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ ایک دوسرے کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے بیوہ عورتیں۔

وہ حیران تھا کہ وہ غازہ کہاں گیا۔ وہ سیندور کہاں اُڑ گیا۔ وہ سُر کہاں غائب ہو گئے جو اس نے کبھی یہاں دیکھے اور سُنے تھے۔ زیادہ عرصہ کی بات نہیں، ابھی وہ کل ہی تو (دو برس بھی کوئی عرصہ ہوتا ہے) یہاں آیا تھا۔ کلکتہ سے جب اسے یہاں کی ایک فرم نے اچھی تنخواہ پر بلایا تھا تو اس نے قیصر پارک میں کتنی کوشش کی تھی کہ اسے کرائے پر ایک کمرہ ہی مل جائے مگر وہ ناکام رہا تھا۔ ہزار فرمائشوں کے باوجود۔

مگر اب اس نے دیکھا کہ جس کنجڑے، جولاہے اور موچی کی طبیعت چاہتی تھی۔ فلیٹوں اور کمروں پر اپنا قبضہ جما رہا تھا۔

جہاں کسی شاندار فلم کمپنی کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ وہاں چولھے سُلگ رہے ہیں۔ جہاں

کبھی شہر کی بڑی بڑی رنگین ہستیاں جمع ہوتی تھیں۔ وہاں دھوبی میلے کپڑے دھو رہے ہیں۔

دو برس میں اتنا بڑا انقلاب!

وہ حیران تھا۔ لیکن اس کو اس انقلاب کا پس منظر معلوم تھا۔ اخباروں کے ذریعہ سے اور ان دوستوں سے جو شہر میں موجود تھے اسے سب پتہ لگ چکا تھا کہ یہاں کیسا طوفان آیا تھا۔ مگر وہ سوچتا تھا کہ یہ کوئی عجیب وغریب طوفان تھا جو عمارتوں کا رنگ روپ بھی چوس کر لے گیا۔ انسانوں نے انسان قتل کئے عورتوں کی بے عزتی کی۔ لیکن عمارتوں کی خشک لکڑیوں اور ان کی اینٹوں سے بھی یہی سلوک کیا۔

اس نے سنا تھا کہ اس طوفان میں عورتوں کو ننگا کیا گیا تھا۔ ان کی چھاتیاں کاٹی گئی تھیں۔ یہاں اس کے آس پاس جو کچھ تھا۔ سب ننگا اور جوبن بریدہ تھا۔

وہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ جس کی مدد سے وہ اپنی رہائش کا کوئی بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ اس دوست نے اس سے کہا تھا کہ تم قیصر پارک کے پاس جہاں تانگے کھڑے رہا کرتے ہیں۔ میرا انتظار کرنا۔

دو برس ہوئے جب وہ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آیا تھا تو یہ ٹانگوں کا اڈہ بہت مشہور جگہ تھی، سب سے عمدہ، سب سے بانکے ٹانگے صرف یہیں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے عیاشی کا ہر سامان مہیا ہو جاتا تھا۔ اچھے سے اچھا ریسٹورنٹ اور ہوٹل قریب تھا۔ بہترین چائے، بہترین کھانا اور دوسرے لوازمات بھی۔

شہر کے جتنے بڑے دلال تھے، وہ یہیں سے دستیاب ہوتے تھے۔ اس لئے کہ قیصر پارک میں بڑی بڑی کمپنیوں کے باعث روپیہ اور شراب پانی کی طرح بہتے تھے۔

اس کو یاد آیا کہ دو برس پہلے اس نے اپنے دوست کے ساتھ بڑے عیش کئے تھے۔ اچھی سے اچھی لڑکی ہر رات کو ان کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اسکاچ جنگ کے باعث نایاب تھی مگر ایک منٹ میں درجنوں بوتلیں مہیا ہو جاتی تھیں۔

ٹانگے اب بھی کھڑے تھے مگر ان پر وہ کلغیاں، وہ پھندنے، وہ پیتل کے پالش کئے ہوئے ساز و سامان کی چمک دمک نہیں تھی۔ یہ بھی شاید دوسری چیزوں کے ساتھ اُڑ گئی تھی۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ فروری کے دن تھے۔ شام کے سائے چھانے شروع ہو گئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے دوست کو لعنت ملامت کی اور دائیں ہاتھ کے ویران ہوٹل میں موری کے پانی سے بنائی ہوئی چائے پینے کے لئے جانے ہی والا تھا کہ کسی

نے اس کو ہولے سے پکارا۔ اس نے خیال کیا کہ شاید اس کا دوست آگیا۔ مگر جب اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک اجنبی تھا۔ عام شکل وصورت کا، لٹھے کی نئی شلوار میں جس میں اب اور زیادہ شکنوں کی گنجائش نہیں تھی۔ نیلی پاپلین کی قمیض میں جو لانڈری میں جانے کے لئے بیتاب تھی۔

اس نے پوچھا۔

''کیوں بھئی۔ تم نے مجھے بلایا؟''

اس نے ہولے سے جواب دیا۔

''جی ہاں''۔

اس نے خیال کیا کہ مہاجر ہے بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ ''کیا مانگتے ہو؟''

اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''جی کچھ نہیں''۔ پھر قریب آ کر کہا۔ ''کچھ چاہئے آپ کو؟''

''کیا؟''

''کوئی لڑکی وڑکی''۔ یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

اس کے سینے میں ایک تیر سا لگا کہ دیکھو اس زمانے میں بھی یہ لوگوں کے جنسی جذبات ٹٹولتا پھرتا ہے۔ اور پھر انسانیت کے متعلق اُوپر تلے اس کے دماغ میں بڑے حوصلہ شکن خیالات آئے۔ انہی خیالات کے زیرِ اثر اس نے پوچھا ''کہاں ہے؟''

اس کا لہجہ دلال کے لئے امید افزا نہیں تھا۔ چنانچہ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کہا۔

''جی نہیں آپ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی''

اس نے اس کو روکا۔ ''یہ تم نے کس طرح جانا۔ انسان کو ہر وقت اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے جو تم مہیا کر سکتے ہو۔ وہ سولی پر بھی۔ جلتی چتا میں بھی......''

وہ فلسفی بننے ہی والا تھا کہ رُک گیا۔ ''دیکھو۔ اگر کہیں پاس ہی ہے تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے یہاں ایک دوست کو وقت دے رکھا ہے''۔

دلال قریب آگیا۔ ''پاس ہی۔ بالکل پاس''۔

''کہاں؟''

''یہ سامنے والی بلڈنگ میں''۔

اس نے سامنے والی بلڈنگ میں دیکھا۔

''اس میں۔ اس بڑی بلڈنگ میں؟''

''جی ہاں''

وہ لرز گیا۔ ''اچھا۔ تو۔؟''

سنبھل کر اس نے پوچھا۔ ''میں بھی چلوں؟''

''چلئے۔ لیکن میں آگے آگے چلتا ہوں۔'' اور دلال نے سامنے والی بلڈنگ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

وہ سینکڑوں روح شگاف باتیں سوچتا اس کے پیچھے ہو لیا۔

چند گزوں کا فاصلہ تھا۔ فوراً طئے ہو گیا۔ دلال اور وہ دونوں اس بڑی بلڈنگ میں تھے۔ جس کی پیشانی پر ایک بورڈ لٹک رہا تھا۔ اس کی حالت سب سے خستہ تھی جگہ جگہ اُکھڑی ہوئی اینٹوں، کٹے ہوئے پانی کے نلوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔

اب شام گہری ہو گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے بڑھے تو اندھیرا شروع ہو گیا۔ چوڑا چکلا صحن طئے کر کے وہ ایک طرف مڑا۔ جہاں عمارت بنتے بنتے رُک گئی تھی۔ ننگی اینٹیں تھیں۔ چونہ اور سیمنٹ ملے ہوئے سخت ڈھیر پڑے تھے اور جا بجا بجری بکھری ہوئی تھی۔

دلال نامکمل سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ مڑ کر اس نے کہا۔

''آپ یہیں ٹھہریئے۔ میں ابھی آیا''۔

وہ رک گیا۔ دلال غائب ہو گیا۔ اس نے منہ اُوپر کر کے سیڑھیوں کے اختتام کی طرف دیکھا تو اسے تیز روشنی نظر آئی۔

دو منٹ گزر گئے تو دبے پاؤں وہ بھی اُوپر چڑھنے لگا۔ آخری زینے پر اسے دلال کی بہت زور کی کڑک سنائی دی۔

''اٹھتی ہے کہ نہیں؟''

کوئی عورت بولی۔ ''کہہ جو دیا مجھے سونے دو''۔ اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ دلال پھر کڑکا۔ ''میں کہتا ہوں اُٹھ ۔ میرا کہا نہیں مانے گی تو یاد رکھ......''

عورت کی آواز آئی۔ ''تو مجھے مار ڈال۔ لیکن میں نہیں اٹھوں گی۔ خدا کے لئے میرے حال پر رحم کر''۔

دلال نے پچکارا۔ ''اُٹھ میری جان۔ ضد نہ کر۔ گزارہ کیسے چلے گا''۔

عورت بولی۔ ''گزارہ جائے جہنم میں۔ میں بھوکی مر جاؤں گی۔ خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کر مجھے نیند آرہی ہے''۔

دلال کی آواز کڑی ہوگئی۔ ''تو نہیں اُٹھے گی۔ حرام زدای، سُور کی بچی......''

عورت چلانے لگی۔ ''میں نہیں اٹھوں گی۔ نہیں اٹھوں گی۔ نہیں اٹھوں گی''۔

دلال کی آواز بھنچ گئی۔

''آہستہ بول۔ کوئی سن لے گا۔ لے چل اُٹھ۔ تیس چالیس روپے مل جائیں گے''۔

عورت کی آواز میں التجا تھی۔ ''دیکھ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں کتنے دنوں سے جاگ رہی ہوں۔ رحم کر۔ خُدا کے لئے مجھ پر رحم کر''۔

''بس ایک دو گھنٹے کے لئے پھر سو جانا۔ نہیں تو دیکھ مجھے سختی کرنی پڑے گی''۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں سے بڑی تیز روشنی آرہی تھی۔

اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے جس کے فرش پر ایک عورت لیٹی ہے۔ کمرے میں دو تین برتن ہیں، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دلال اس عورت کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں داب رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس عورت سے کہا۔ ''لے اب اُٹھ۔ قسم خدا کی ایک دو گھنٹے میں آجائے گی۔ پھر سو جانا''۔

وہ عورت ایک دم یوں اُٹھی جیسے آگ دکھائی ہوئی چھچھوندر اٹھتی ہے اور چلائی۔ ''اچھا اٹھتی ہوں''۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اصل میں وہ ڈر گیا تھا۔ دبے پاؤں وہ تیزی سے نیچے اُتر گیا۔ اس نے سوچا کہ بھاگ جائے۔ اس شہر ہی سے بھاگ جائے۔ اس دُنیا سے بھاگ جائے۔ مگر کہاں؟''

پھر اس نے سوچا کہ یہ عورت کون ہے؟ کیوں اس پر اتنا ظلم ہو رہا ہے؟۔ اور یہ دلال کون ہے؟۔ اس کا کیا لگتا ہے اور یہ اس کمرے میں اتنا بڑا بلب جلا کر جو سو کینڈل پاور سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ کیوں رہتے ہیں۔ کب سے رہتے ہیں؟

اس کی آنکھوں میں اس تیز بلب کی روشنی ابھی تک گھسی ہوئی تھی۔ اس کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی تیز روشنی میں کون سو سکتا ہے؟۔ اتنا بڑا بلب؟۔ کیا وہ چھوٹا نہیں لگا سکتے۔ یہی پندرہ، پچیس کینڈل پاور کا؟

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ دو سائے اس کے پاس کھڑے

ہیں۔ ایک نے جو دلاّل کا تھا۔ اس سے کہا۔

"دیکھ لیجئے"۔

اس نے کہا۔ "دیکھ لیا ہے"۔

"ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے"۔

چالیس روپے ہوں گے"۔

"ٹھیک ہے"۔

"دے دیجئے"۔

وہ اب سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ جیب میں اس نے ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر دلاّل کے حوالے کر دیئے۔

"دیکھ لو کتنے ہیں؟"

نوٹوں کی کھڑ کھڑاہٹ سنائی دی۔

دلاّل نے کہا۔ "پچاس ہیں"۔

اس نے کہا۔ "پچاس ہی رکھو"۔

"صاحب سلام"۔

اس کے جی میں آئی کہ ایک بہت بڑا پتھر اس کو دے مارے۔

دلاّل بولا۔ "تو لے جایئے اسے۔ لیکن دیکھئے تنگ نہ کیجئے گا اور پھر ایک دو گھنٹے کے بعد چھوڑ جایئے گا"۔

"بہتر"۔

اس نے بڑی بلڈنگ کے باہر نکلنا شروع کیا جس کی پیشانی پر وہ کئی بار ایک بہت بڑا بورڈ پڑھ چکا تھا۔

باہر تانگہ کھڑا تھا۔ وہ آگے بیٹھ گیا۔ اور عورت پیچھے۔

دلاّل نے ایک بار پھر سلام کیا اور ایک بار پھر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑا پتھر اُٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

تانگہ چل پڑا۔ وہ اسے پاس ہی ایک ویران سے ہوٹل میں لے گیا۔ دماغ کی حتی المقدور اس تکدر سے جو اسے پہنچ چکا تھا نکال کر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو سر سے پیر

تک اُجاڑ تھی۔ اس کے پپوٹے سُوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا اُوپر کا دھڑ بھی سارے کا سارا خمیدہ تھا جیسے وہ ایک ایسی عمارت ہے جو پل بھر میں گر جائے گی۔

وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"ذرا گردن تو اُونچی کیجئے"۔

وہ زور سے چونکی۔ "کیا؟"۔

"کچھ نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی بات تو کیجئے"۔

اس کی آنکھیں سُرخ بوٹی ہو رہی تھیں جیسے ان میں مرچیں ڈالی گئی ہوں۔ وہ خاموش رہی۔

"آپ کا نام؟"

"کچھ بھی نہیں؟" اس کے لہجے میں تیزاب کی سی تیزی تھی۔

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

"جہاں کی بھی تم سمجھ لو"۔

"آپ اتنا روکھا کیوں بولتی ہیں"۔

عورت اب قریب قریب جاگ پڑی اور اس کی طرف لال بوٹی آنکھوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔ "تم اپنا کام کرو۔ مجھے جانا ہے"۔

اس نے پوچھا۔ "کہاں؟"

عورت نے بڑی روکھی اور بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "جہاں سے مجھے تم لائے ہو"۔

"آپ چلی جایئے"۔

"تم اپنا کام کرو نا۔ مجھے تنگ کیوں کرتے ہو؟"

اس نے اپنے لہجے میں دل کا سارا درد بھر کے اس سے کہا۔ "میں تمہیں تنگ نہیں کرتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے"۔

وہ جھلا گئی۔ "مجھے نہیں چاہئے کوئی ہمدرد"۔ پھر قریب قریب چیخ پڑی۔ "تم اپنا کام کرو اور مجھے جانے دو"۔

اس نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو اس عورت نے زور سے ایک طرف جھٹک دیا۔

"میں کہتی ہوں۔ میں کہتی ہوں مجھے تنگ نہ کرو۔ میں کئی دنوں سے جاگ رہی ہوں۔

جب سے آئی ہوں۔ جاگ رہی ہوں"۔

وہ سر تا پا ہمدردی بن گیا۔

"سو جاؤ یہیں"۔

عورت کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ تیز لہجے میں بولی۔ "میں یہاں سونے نہیں آئی ۔۔ یہ میرا گھر نہیں"۔

تمہارا گھر وہ ہے جہاں سے تم آئی ہو؟"

عورت اور زیادہ خشمناک ہو گئی۔

"اف ۔۔ بکواس بند کرو۔ میرا کوئی گھر نہیں ۔۔ تم اپنا کام کرو ورنہ مجھے چھوڑ آؤ اور اپنے روپے لے لو اس...... اس......" وہ گالی دیتی رہ گئی۔

اس نے سوچا کہ اس عورت سے ایسی حالت میں کچھ پوچھنا اور ہمدردی جتانا فضول ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

"چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں"۔

اور وہ اسے اس بڑی بلڈنگ میں چھوڑ آیا۔

دوسرے دن اس نے قیصر پارک کے ایک ویران ہوٹل میں اس عورت کی ساری داستان اپنے دوست کو سنائی۔ دوست پر رقت طاری ہو گئی۔ اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا۔

"کیا جوان تھی؟"

اس نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں ۔۔ میں اسے اچھی طرح بالکل نہ دیکھ سکا۔ میرے دماغ میں تو ہر وقت یہ خیال آتا تھا کہ میں نے وہیں سے پتھر اٹھا کر دلال کا سر کیوں نہ کچل دیا"۔

دوست نے کہا۔ "واقعی بڑے ثواب کا کام ہوتا"۔

وہ زیادہ دیر تک ہوٹل میں اپنے دوست کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ اس کے دل و دماغ پر پچھلے روز کے واقعہ کا بہت بوجھ تھا۔ چنانچہ چائے ختم ہوئی تو دونوں رخصت ہو گئے۔

اس کا دوست چپکے سے تانگوں کے اڈے پر آیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی نگاہیں اس دلال کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نظر نہ آیا۔ چھ بج چکے تھے۔ بڑی بلڈنگ سامنے تھی چند گزوں کے فاصلے پر۔ وہ اس طرف چل دیا اور اس میں داخل ہو گیا۔

لوگ اندر آ جا رہے تھے۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے اس مقام پر پہنچ گیا۔ کافی اندھیرا تھا مگر جب وہ ان سیڑھیوں کے پاس پہنچا تو اسے روشنی دکھائی دی۔ اوپر دیکھا اور دبے پاؤں اوپر

چڑھنے لگا۔ کچھ دیر وہ آخری زینے پر خاموش کھڑا رہا۔ کمرے سے تیز روشنی آرہی تھی۔ مگر کوئی آواز، کوئی آہٹ اسے سنائی نہ دی۔ آخری زینہ طے کر کے وہ آگے بڑھا۔ دروازے کے پٹ کھلے تھے۔ اس نے ذرا ادھر ہٹ کر اندر جھانکا۔ سب سے پہلے اسے بلب نظر آیا۔ جس کی روشنی اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ ایک دم وہ پرے ہٹ گیا تاکہ تھوڑی دیر اندھیرے کی طرف منہ کر کے اپنی آنکھوں سے چکا چوند نکال سکے۔

اس کے بعد وہ پھر دروازے کی طرف بڑھا مگر اس انداز سے کہ اس کی آنکھیں بلب کی تیز روشنی کی زد میں نہ آئیں۔ اس نے اندر جھانکا۔ فرش کا جو حصہ اسے نظر آیا۔ اس پر ایک عورت چٹائی پر لیٹی تھی۔ اس نے اسے غور سے دیکھا۔ سو رہی تھی۔ منہ پر دوپٹہ تھا۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ سے ہل رہا تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھا۔ اس کی چیخ نکل گئی مگر اس نے فوراً ہی دبالی۔ اس عورت سے کچھ دور ننگے فرش پر ایک آدمی پڑا تھا۔ جس کا سر پاش پاش تھا۔ پاس ہی خون آلود اینٹ پڑی تھی۔ یہ سب اس نے ایک دم دیکھا۔ اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ پاؤں پھسلا اور نیچے۔ مگر اس نے چوٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور ہوش و حواس قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل اپنے گھر پہنچا اور ساری رات ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

شادی

جمیل کو اپنا شیفر لائف ٹائم قلم مرمت کے لئے دینا تھا۔ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں شیفر کمپنی کا نمبر تلاش کیا۔ فون کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کے ایجنٹ میسرز ڈی، جے، سمتوئر ہیں جن کا دفتر گرین ہوٹل کے پاس واقع ہے۔ جمیل نے ٹیکسی لی اور فورٹ کی طرف چل دیا۔ گرین ہوٹل پہنچ کر اسے میسرز ڈی، جے، سمتوئر کا دفتر تلاش کرنے میں دقت نہ ہوئی۔ بالکل پاس تھا مگر تیسری منزل پر۔

لفٹ کے ذریعے جمیل وہاں پہنچا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی چوبی دیوار کی چھوٹی سی کھڑکی کے پیچھے اسے ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی نظر آئی جس کی چھاتیاں غیر معمولی طور پر نمایاں تھیں۔ جمیل نے قلم اس کھڑکی کے اندر داخل کر دیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ لڑکی نے قلم اس کے ہاتھ سے لے لیا، کھول کر ایک نظر دیکھا اور ایک چٹ پر کچھ لکھ کر جمیل کے حوالے کر دی۔ منہ سے وہ بھی کچھ نہ بولی۔

جمیل نے چٹ دیکھی۔ قلم کی رسید تھی۔ چلنے ہی والا تھا کہ پلٹ کر اس نے لڑکی سے پوچھا: ''دس بارہ روز تک تیار ہو جائے گا، میرا خیال ہے۔''

لڑکی بڑے زور سے ہنسی۔ جمیل کچھ کھسیانا سا ہو گیا: ''میں آپ کی اس ہنسی کا مطلب نہیں سمجھا۔''

لڑکی نے کھڑکی کے ساتھ منہ لگا کر کہا: ''مسٹر —— آج کل وار ہے وار —— یہ قلم امریکہ جائے گا —— تم نو مہینے کے بعد پتا کرنا۔''

جمیل بوکھلا گیا: ''نو مہینے!''

لڑکی نے اپنے بریدہ بالوں والا سر ہلایا— جمیل نے لفٹ کا رخ کیا۔

یہ نو مہینے کا سلسلہ خوب تھا— نو مہینے اتنی مدّت کے بعد تو عورت گل گوتھنا بچہ پیدا کر کے ایک طرف رکھ دیتی ہے— نو مہینے— نو مہینے تک اس چھوٹی سی چٹ کو سنبھالے رکھو— اور یہ بھی کون وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ نو مہینے تک آدمی یاد رکھ سکتا ہے کہ اس نے ایک قلم مرمت کے لئے دیا تھا— ہو سکتا ہے اس دوران میں وہ کم بخت مر کھپ ہی جائے۔

جمیل نے سوچا، یہ سب ڈھکوسلا ہے— قلم میں معمولی سی خرابی تھی کہ اس کا فیڈر ضرورت سے زیادہ روشنائی سپلائی کرتا تھا۔ اس کے لئے اسے امریکہ کے ہسپتال میں بھیجنا صریحاً چالبازی تھی— مگر پھر اس نے سوچا لعنت بھیجو جی اس قلم پر——امریکہ جائے یا افریقہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے یہ بلیک مارکیٹ سے ایک سو چھتر روپے میں خریدا تھا— مگر اس نے ایک برس اسے خوب استعمال بھی تو کیا تھا——ہزاروں صفحے کالے کر ڈالے تھے— چنانچہ وہ قنوطی سے ایک دم رجائی بن گیا۔ اور رجائی بنتے ہی اسے خیال آیا کہ وہ فورٹ میں ہے اور فورٹ میں شراب کی بے شمار دکانیں۔ وسکی تو ظاہر ہے نہیں ملے گی لیکن فرانس کی بہترین کونک برانڈی تو مل جائے گی؛ چنانچہ اس نے قریب والی شراب کی دکان کا رخ کیا۔

برانڈی کی ایک بوتل خرید کر وہ لوٹ رہا تھا کہ گرین ہوٹل کے پاس آ کے رک گیا۔ ہوٹل کے نیچے قد آدم شیشوں کا بنا ہوا قالینوں کا شوروم تھا۔ یہ جمیل کے دوست پیر صاحب کا تھا۔

اس نے سوچا چلو اندر چلیں۔ چنانچہ چند لمحات کے بعد ہی وہ شوروم میں تھا اور اپنے دوست پیر سے، جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا، ہنسی مذاق کی گفتگو کر رہا تھا۔

برانڈی کی بوتل باریک کاغذ میں لپٹی دبیز ایرانی قالین پر لیٹی ہوئی تھی۔ پیر صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جمیل سے کہا: ''یار! اس دلہن کا گھونگٹ تو کھولو— ذرا اس سے چھیڑ خانی تو کرو۔''

جمیل مطلب سمجھ گیا: ''تو پیر صاحب! گلاس اور سوڈے منگوایئے۔ پھر دیکھئے کیا رنگ جمتا ہے۔''

فوراً گلاس اور یخ بستہ سوڈے آ گئے۔ پہلا دور ہوا۔ دوسرا دور شروع ہونے ہی والا تھا کہ پیر صاحب کے ایک گجراتی دوست اندر چلے آئے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے ہوٹل کا چھوکرا دو کے بجائے تین گلاس اٹھا لایا تھا۔ پیر صاحب کے گجراتی دوست نے

بڑی صاف اردو میں چند ادھر ادھر کی باتیں کیں اور گلاس میں یہ بڑا پیگ ڈال کر اس کو سوڈے سے لبالب بھر دیا۔ تین چار لمبے لمبے گھونٹ لے کر انہوں نے رومال سے اپنا منہ صاف کیا: ''سگریٹ نکالو یار!''

پیر صاحب میں ساتوں عیب شرعی تھے مگر وہ سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ جمیل نے جیب سے اپنا سگریٹ کیس نکالا اور قالین پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی لائٹر——

اُس پر پیر صاحب نے جمیل سے اُس گجراتی کا تعارف کرایا۔ ''مسٹر نٹور لال'' آپ موتیوں کی دلالی کرتے ہیں۔

جمیل نے ایک لطیفے کے لئے سوچا، کوئلوں کی دلالی میں تو انسان کا منہ کالا ہوتا ہے—— موتیوں کی دلالی میں——

پیر صاحب نے جمیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''مسٹر جمیل۔ مشہور سونگ رائٹر——''

دونوں نے ہاتھ ملایا اور برانڈی کا نیا دور شروع ہوا اور ایسا شروع ہوا کہ بوتل خالی ہوگئی۔

جمیل نے دل میں سوچا یہ کم بخت موتیوں کا دلال بلا کا پینے والا ہے—— میری پیاس اور سرور کی ساری برانڈی چڑھا گیا۔ خدا کرے اسے موتیا بند ہو۔

مگر جونہی آخری دور کے پیگ نے جمیل کے پیٹ میں اپنے قدم جمائے، اس نے نٹور لال کو معاف کر دیا۔ اور آخر میں اس سے کہا: ''مسٹر نٹور اٹھئے، ایک بوتل اور ہو جائے۔''

نٹور لال فوراً اٹھا۔ اپنے سفید دگلے کی شکنیں درست کیں۔ دھوتی کی لانگ ٹھیک کی اور کہا ''چلئے!''

جمیل پیر صاحب سے مخاطب ہوا: ''ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔''

جمیل اور نٹور نے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور شراب کی دکان پر پہنچے۔ جمیل نے ٹیکسی روکی مگر نٹور نے کہا: ''مسٹر جمیل—— یہ دکان ٹھیک نہیں۔ ساری چیزیں مہنگی بیچتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے مخاطب ہوا: ''دیکھو کولابہ چلو!''

کولابہ پہنچ کر نٹور، جمیل کو شراب کی ایک چھوٹی سی دکان میں لے گیا۔ جو برانڈ جمیل نے فورٹ سے لیا، وہ تو مل نہ سکا، ایک دوسرا مل گیا جس کی نٹور نے بہت تعریف کی کہ نمبر ون ہے۔

یہ نمبر ون چیز خرید کر دونوں باہر نکلے—— ساتھ ہی بار تھی۔ نٹور رک گیا: ''مسٹر جمیل! کیا خیال ہے آپ کا، ایک دو پیگ یہیں سے پی کر چلتے ہیں۔''

جمیل کو کوئی اعتراض نہیں تھا، اس لئے کہ اس کا نشہ حالت نزع میں تھا۔ چنانچہ دونوں

بار کے اندر داخل ہوئے۔ معاً جمیل کو خیال آیا کہ بار والے تو کبھی باہر کی شراب پینے کی اجازت نہیں دیا کرتے۔ ''مسٹر نٹور آپ یہاں کیسے پی سکتے ہیں۔ یہ لوگ اجازت نہیں دیں گے۔''

نٹور نے زور سے آنکھ ماری: ''سب چلتا ہے۔''

اور یہ کہہ کر ایک کیبن کے اندر گھس گیا۔ جمیل بھی اس کے پیچھے ہولیا——نٹور نے بوتل سنگین تپائی پر رکھی اور بیرے کو آواز دی——جب وہ آیا تو اس کو بھی آنکھ ماری: ''دیکھو! دو سوڈے روجرز——ٹھنڈے——اور دو گلاس۔ ایک دم صاف!''

بیرا یہ حکم سن کر چلا گیا اور فوراً سوڈے اور گلاس حاضر کر دیئے۔ اس پر نٹور نے اسے دوسرا حکم دیا: ''فسٹ کلاس چپس اور ٹومیٹو سوس——اور فسٹ کلاس کٹلس!''

بیرا چلا گیا۔ نٹور جمیل کی طرف دیکھ کر ایسے ہی مسکرایا۔ بوتل کا کارک نکالا اور جمیل کے گلاس میں اس سے پوچھے بغیر ایک ڈبل ڈال دیا۔ خود اس سے کچھ زیادہ۔ سوڈا حل ہو گیا تو دونوں نے اپنے گلاس ٹکرائے۔ جمیل پیاسا تھا۔ ایک ہی جرعے میں اس نے آدھا گلاس ختم کر دیا۔

سوڈا چونکہ بہت ٹھنڈا اور تیز تھا اس لئے پھوں پھوں کرنے لگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد چپس اور کٹلس آ گئے——جمیل صبح گھر سے ناشتہ کر کے نکلا تھا لیکن برانڈی نے اسے بھوک لگا دی۔ چپس گرم گرم تھے، کٹلس بھی۔ وہ پل پڑا——نٹور نے اس کا ساتھ دیا۔ چنانچہ دو منٹ میں دونوں پلیٹیں صاف!

دو پلیٹیں اور منگوائی گئیں۔ جمیل نے اپنے لئے چپس بھی منگوائے۔ دو گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ بوتل کی تین چوتھائی غائب ہو چکی تھی۔ جمیل نے سوچا کہ اب پیر صاحب کے پاس جانا بیکار ہے۔ نشے خوب جم رہے تھے، سرور خوب گھٹ رہے تھے۔ نٹور اور جمیل دونوں ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے۔ ایسے سواروں کو عام طور پر ایسی وادیوں میں جانے کی بڑی خواہش ہوتی ہے جہاں انہیں عریاں بدن حسین عورتیں ملیں۔ وہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر بٹھالیں اور یہ جا وہ جا!

جمیل کا دل و دماغ اس وقت کسی ایسی ہی وادی کے متعلق سوچ رہا تھا جہاں اس کی کسی ایسی خوبصورت عورت سے مڈبھیر ہو جائے جس کو وہ اپنے تپتے ہوئے سینے کے ساتھ بھینچ لے اس زور سے کہ اس کی ہڈیاں تک چیخ جائیں۔

جمیل کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ ایسی جگہ پر ہے——مطلب ہے ایسے علاقے میں ہے جو اپنے بردتھلز (قحبہ خانے) کی وجہ سے ساری بمبئی میں مشہور ہے، جنہیں عیاشی کرنا ہوتی ہے وہ ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ شہر سے بھی جس لڑکی کو الگ چھپ کر پیشہ کرنا ہوتا ہے، یہیں آتی ہے۔ ان

معلومات کی بنا پر اس نے نٹور سے کہا: ''میں نے کہا— وہ— وہ— میرا مطلب ہے، ادھر کوئی چھوکری وکری نہیں ملتی؟''

نٹور نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ انڈیلا اور ہنسا: ''مسٹر جمیل! ایک نہیں، ہزاروں ——ہزاروں——ہزاروں——''

یہ ہزاروں کی گردان جاری رہتی اگر جمیل نے اس کی بات کاٹی نہ ہوتی: ''ان ہزاروں میں سے آج ایک ہی مل جائے تو ہم سمجھیں کہ نٹور بھائی نے کمال کر دیا۔''

نٹور بھائی مزے میں تھے۔ جھوم کر کہا: ''جمیل بھائی——ایک نہیں ہزاروں— چلو، اس کو ختم کرو۔''

دونوں نے بوتل میں جو کچھ بچا تھا آدھ گھنٹے کے اندر اندر ختم کر دیا۔ بل ادا کرنے اور بیرے کو تگڑی ٹپ دینے کے بعد دونوں باہر نکلے۔ اندر اندھیرا تھا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ جمیل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ایک لحظے کے لئے اسے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں تیز روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے نٹور سے کہا: ''چلو بھئی!''

نٹور نے تلاشی لینے والی نگاہوں سے جمیل کی طرف دیکھا: ''مال پانی ہے نا؟''

جمیل کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نٹور کی پسلیوں میں کہنی سے ٹھوکا دے کر اس نے کہا: ''بہت۔ نٹور بھائی، بہت۔'' اور اس نے جیب سے پانچ نوٹ سوسو کے نکالے: ''کیا اتنے کافی نہیں؟''

نٹور کی باچھیں کھل گئیں: ''کافی——؟ بہت زیادہ ہیں— چلو آؤ، پہلے ایک بوتل خرید لیں، وہاں ضرورت پڑے گی۔''

جمیل نے سوچا بات بالکل ٹھیک ہے، وہاں ضرورت نہیں پڑے گی تو کیا کسی مسجد میں پڑے گی۔ چنانچہ فوراً ایک بوتل خرید لی گئی۔ ٹیکسی کھڑی تھی۔ دونوں اس میں بیٹھ گئے اور اس وادی کی سیاحی کرنے لگے۔

سینکڑوں بروتھلز تھے۔ ان میں سے بیس پچیس کا جائزہ لیا گیا، مگر جمیل کو کوئی عورت پسند نہ آئی۔ سب میک اپ کی موٹی اور شوخ تہوں کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ جمیل چاہتا تھا کہ ایسی لڑکی ملے جو مرمت شدہ مکان معلوم نہ ہو۔ جس کو دیکھ کر یہ احساس نہ ہو کہ جگہ جگہ اکھڑے ہوئے پلستر کے ٹکڑوں پر بڑے اناڑی پن سے سرخی اور چونا لگایا گیا ہے۔

نٹور تنگ آ گیا۔ اس کے سامنے جو بھی عورت آتی تھی، وہ جمیل کا کندھا پکڑ کر کہتا:

''جمیل بھائی، چلے گی!''

مگر جمیل بھائی اٹھ کھڑا ہوتا: ''ہاں چلے گی ——— اور ہم بھی چلیں گے!''

دو جگہیں اور دیکھی گئیں مگر جمیل کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ سوچتا تھا کہ ان عورتوں کے پاس کون آتا ہے جو سؤر کے سوکھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی ادائیں کتنی مکروہ ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کا انداز کتنا فحش ہے، اور کہنے کو یہ پرائیویٹ ہیں یعنی ایسی عورتیں جو در پردہ پیشہ کراتی ہیں ——— جمیل کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ پردہ ہے کہاں جس کے پیچھے یہ دھندا کرتی ہیں۔

جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ اب پروگرام کیا ہونا چاہئے، کہ نٹور نے ٹیکسی رکوائی اور اتر کر چلا گیا کہ ایک دم اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا۔

اب جمیل اکیلا تھا۔ ٹیکسی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ اس وقت ساڑھے چار بج چکے تھے ——— اس نے ڈرائیور سے پوچھا: ''یہاں کوئی بھڑوا ملے گا؟''

ڈرائیور نے جواب دیا: ''ملے گا جناب!''

''تو چلو اس کے پاس!''

ڈرائیور نے دو تین موڑ گھومے اور ایک پہاڑی بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس گاڑی کھڑی کر دی۔ دو تین مرتبہ ہارن بجایا۔

جمیل کا سر نشے کے باعث سخت بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھائی ہوئی تھی ——— اسے معلوم نہیں کیسے اور کس طرح، مگر جب اس نے ذرا دماغ کو جھٹکا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک پلنگ پر بیٹھا ہے اور اس کے پاس ہی ایک جوان لڑکی، جس کی ناک کی پھننگ پر چھوٹی سی پھنسی تھی، اپنے بریدہ بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔

جمیل نے اس کو غور سے دیکھا۔ سوچنے ہی والا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا مگر اس کے شعور نے اس کو مشورہ دیا کہ دیکھو یہ سب عبث ہے جمیل نے سوچا، یہ ٹھیک ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اندر ہی اندر نوٹ گن کر اور پاس پڑی ہوئی تپائی پر برانڈی کی سالم بوتل دیکھ کر اپنی تشفی کر لی کہ سب خیریت ہے۔ اس کا نشہ کسی قدر نیچے اتر گیا۔

اٹھ کر وہ اس گیسو بُریدہ لڑکی کے پاس گیا اور، اور کچھ سمجھ میں نہ آیا مسکرا کر اس سے کہا: ''کہیے، مزاج کیسا ہے؟''

اس لڑکی نے کنگھی میز پر رکھی اور کہا: ''کہیے، آپ کا کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہوں!'' یہ کہہ کر اس نے اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالا —— ''آپ کا نام؟''

''بتا تو چکی ایک دفعہ —— آپ کو میرا خیال ہے یہ بھی یاد نہ رہا ہوگا کہ آپ ٹیکسی میں یہاں آئے —— جانے کہاں کہاں گھومتے رہے ہوں گے کہ بل اڑتیس روپے بنا جو آپ نے ادا کیا اور ایک شخص جس کا نام شاید نور تھا، آپ نے اس کو بے شمار گالیاں دیں۔''

جمیل اپنے اندر ڈوب کر سارے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا کہ فی الحال اس کی ضرورت نہیں، میں بھول جایا کرتا ہوں —— یا یوں سمجھئے کہ مجھے بار بار پوچھنے میں مزا آتا ہے —— وہ صرف اتنا یاد کر سکا کہ اس نے ٹیکسی والے کا بل جو کہ اڑتیس روپے بنتا تھا، ادا کیا تھا۔

لڑکی پلنگ پر بیٹھ گئی: ''میرا نام تارہ ہے!''

جمیل نے اس کو لٹا دیا اور اس سے مصنوعی قسم کا پیار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے تارہ سے کہا: ''دو یخ بستہ سوڈے اور گلاس!''

تارہ نے یہ دونوں چیزیں فوراً حاضر کر دیں۔ جمیل نے بوتل کھولی۔ اپنے لئے ایک پیگ ڈال کر اس نے دوسرا تارہ کے لئے ڈالا —— پھر دونوں پینے لگے۔

تین پیگ پینے کے بعد جمیل نے محسوس کیا کہ اس کی حالت بہتر ہو گئی ہے۔ تارہ کو چومنے چاٹنے کے بعد اس نے سوچا کہ اب قصہ مختصر ہو جانا چاہئے: ''کپڑے اتار دو!''

''سارے؟''

''ہاں سارے!''

تارہ نے کپڑے اتار دیئے اور لیٹ گئی۔ جمیل نے اس کے ننگے جسم کو ایک نظر دیکھا اور یہ رائے قائم کی کہ اچھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی خیالات کا ایک تانتا بندھ گیا۔ جمیل کا نکاح ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔

اس کا بدن کیسا ہوگا —— کیا وہ تارہ کی طرح اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اپنے سارے کپڑے اتار کر اس کے ساتھ لیٹ جائے گی؟

کیا وہ اس کے ساتھ برانڈی پئے گی؟

کیا اس کے بال کٹے ہوئے ہیں؟

پھر فوراً اس کا ضمیر جاگا جس نے اس کو لعنت ملامت شروع کر دی۔ نکاح کا یہ مطلب تھا

کہ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ صرف ایک مرحلہ باقی تھا کہ وہ اپنی سسرال جائے اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئے —— کیا اس کے لئے یہ واجب تھا کہ ایک بازاری عورت کو اپنے آغوش کی زینت بنائے —— خم کے خم لنڈھاتا پھرے۔

جمیل بہت خفیف ہوا اور اسی خفت میں اس کی آنکھیں مندنا شروع ہو گئیں اور وہ سو گیا تارہ بھی تھوڑی دیر کے بعد خواب غفلت کے مزے لینے لگی۔

جمیل نے کئی بے ربط، اوٹ پٹانگ خواب دیکھے —— کوئی دو گھنٹے کے بعد جب کہ ایک بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا تھا، وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ جب اچھی طرح آنکھیں کھلیں تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اجنبی کمرے میں ہے اور اس کے ساتھ الف ننگی لڑکی لیٹی ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد واقعات آہستہ آہستہ اس کے دماغ کی دھند چیر کر نمودار ہونے لگے۔

وہ خود بھی الف ننگا تھا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے الٹا پاجامہ پہن لیا، مگر اس کو احساس نہ ہوا۔ کرتا پہن کر اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ نوٹ سب کے سب موجود تھے۔ اس نے سوڈا کھولا اور ایک پیگ بنا کر پیا۔ پھر اس نے تارہ کو ہولے سے جھنجوڑا: ''اٹھو!''

تارہ آنکھیں ملتی اٹھی۔ جمیل نے اس سے کہا: ''کپڑے پہن لو!''

تارہ نے کپڑے پہن لئے —— باہر گہری شام رات بننے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ جمیل نے سوچا، اب کوچ کرنا چاہئے۔ لیکن وہ تارہ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا، کیونکہ بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل گئی تھیں: ''کیوں تارہ جب ہم لیٹے —— میرا مطلب ہے جب میں نے تم سے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس کے بعد کیا ہوا؟''

تارہ نے جواب دیا: ''کچھ نہیں — آپ نے اپنے کپڑے اتارے اور میرے بازو پر ہاتھ پھیرتے پھیرتے سو گئے۔''

''بس؟''

''ہاں —— لیکن سونے سے پہلے آپ دو تین مرتبہ بڑبڑائے اور کہا: ''میں گنہگار ہوں — میں گنہگار ہوں۔'' یہ کہہ کر تارہ اٹھی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔

جمیل بھی اٹھا۔ گناہ کا احساس دبانے کے لئے اس نے ڈبل پیگ اپنے حلق میں جلدی جلدی انڈیلا۔ بوتل کو کاغذ میں لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

تارہ نے پوچھا: ''چلے؟''

''ہاں، پھر بھی آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ لوہے کی پیچ دار سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ بڑے

بازار کی طرف اس کے قدم اٹھنے ہی والے تھے کہ ہارن بجا اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اس نے کہا چلو اچھا ہوا، یہیں مل گئی۔ پیدل چلنے کی زحمت سے بچ گئے۔

اس نے ڈرائیور سے پوچھا: ''کیوں بھائی خالی ہے؟''

ڈرائیور نے جواب دیا: ''خالی ہے کا کیا مطلب —— لگی ہوئی ہے!''

''تو پھر ....'' یہ کہہ کر جمیل مڑا، لیکن ڈرائیور نے اس کو پکارا: ''کدھر جاتا ہے سیٹھ؟''

جمیل نے جواب دیا: ''کوئی اور ٹیکسی دیکھتا ہوں''

ڈرائیور باہر نکل آیا: ''مستک تو نہیں پھرے لا —— یہ ٹیکسی تمہیں نے تو لے رکھی ہے!''

جمیل بوکھلا گیا: ''میں نے؟''

ڈرائیور نے بڑے گنوار لہجے میں اس سے کہا: ''ہاں تو نے —— سالا دارو پی کر سب کچھ بھول گیا۔''

اس پر تو تو میں میں شروع ہوئی۔ ادھر ادھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جمیل نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا: ''چلو!''

ڈرائیور نے ٹیکسی چلائی: ''کدھر؟''

جمیل نے کہا: ''پولیس اسٹیشن؟''

ڈرائیور نے اس پر جانے کیا واہی تباہی بکی —— جمیل سوچ میں پڑ گیا۔ جو ٹیکسی اس نے لی تھی، اس کا بل جو اڑتیس روپے کا تھا، اس نے ادا کر دیا تھا۔ اب یہ نئی ٹیکسی کہاں سے آن ٹپکی۔ گو وہ نشے کی حالت میں تھا مگر وہ یقینی طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ ٹیکسی نہیں تھی، اور نہ یہ ڈرائیور وہ ڈرائیور جو اسے یہاں لایا تھا۔

پولیس اسٹیشن پہنچے۔ جمیل کے قدم بہت بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ سب انسپکٹر جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے جمیل کو کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔

ڈرائیور نے اپنی داستان شروع کر دی جو سرتاپا غلط تھی۔ جمیل یقیناً اس کی تردید کرتا مگر اس میں زیادہ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سب انسپکٹر سے مخاطب ہو کر اس نے کہا'' جناب! میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا قصہ ہے جو ٹیکسی میں نے لی تھی، اس کا کرایہ میں نے اڑتیس روپے ادا کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ کون ہے اور مجھ سے کیسا کرایہ مانگتا ہے''

ڈرائیور نے کہا: حضور انسپکٹر بہادر! یہ دارو پئے ہے'' اور ثبوت کے طور پر اس نے جمیل کی برانڈی کی بوتل میز پر رکھ دی۔

جمیل جھنجلا گیا: "ارے بھئی کون سؤر کہتا ہے کہ اس نے نہیں پی ——— سوال تو یہ ہے کہ آپ کہاں سے تشریف لے آئے۔"

سب انسپکٹر شریف آدمی تھا۔ کرایہ ڈرائیور کے حساب سے بیالیس روپے بنتا تھا۔ اس نے پندرہ روپے میں فیصلہ کر دیا۔ ڈرائیور بہت چیخا چلایا مگر سب انسپکٹر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر تھانے سے نکلوا دیا۔ پھر اس نے ایک سپاہی سے کہا کہ وہ دوسری ٹیکسی لائے۔ ٹیکسی آئی تو اس نے ایک سپاہی جمیل کے ساتھ کر دیا کہ وہ اسے گھر چھوڑ آئے۔ جمیل نے لکنت بھرے لہجے میں اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور پوچھا "جناب کیا یہ گرانٹ روڈ پولیس اسٹیشن ہے؟"

سب انسپکٹر نے زور کا قہقہہ لگایا اور پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "مسٹر! اب ثابت ہو گیا کہ تم نے خوب پی رکھی ہے ——— یہ کولابہ پولیس اسٹیشن ہے ——— جاؤ، اب گھر جا کر سو جاؤ۔"

جمیل گھر جا کے کھانا کھائے اور کپڑے اتارے بغیر سو گیا ——— برانڈی کی بوتل بھی اس کے ساتھ سوتی رہی۔

دوسرے روز وہ دس بجے کے قریب اٹھا۔ جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ سر میں جیسے بڑے بڑے وزنی پتھر تھے۔ منہ کا ذائقہ خراب۔ اس نے اٹھ کر دو تین گلاس فروٹ سالٹ کے پیئے، چار پانچ پیالے چائے کے۔ کہیں شام کو جا کر طبیعت کسی قدر بحال ہوئی اور اس نے خود کو گزشتہ واقعات کے متعلق سوچنے کے قابل محسوس کیا۔

بہت لمبی زنجیر تھی۔ ان میں سے بعض کڑیاں تو سلامت تھیں، مگر بعض غائب۔ واقعات کا تسلسل شروع سے لے کر گرین ہوٹل اور وہاں سے لے کر کولابہ تک بالکل صاف تھا۔ اس کے بعد جب نٹور کے ساتھ خاص وادی کی سیاحی شروع ہوتی تھی۔ معاملہ گڈمڈ ہو جاتا تھا۔ چند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ بڑی واضح، مگر فوراً مبہم پرچھائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہ کیسے اس لڑکی کے گھر پہنچا ——— اس کا نام جمیل کے حافظے سے پھسل کر جانے کس کھڈ میں جا گرا تھا۔ اس کی شکل و صورت اسے البتہ بڑی اچھی طرح یاد تھی۔

وہ اس کے گھر کیسے پہنچا تھا ——— یہ جاننا بہت اہم تھا۔ اگر جمیل کا حافظہ اس کی مدد کرتا تو بہت سی چیزیں صاف ہو جاتیں۔ مگر بصد کوشش وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

اور یہ ٹیکسیوں کا کیا سلسلہ تھا۔ اس نے پہلی کو تو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسری کہاں سے ٹپک پڑی تھی؟

سوچ سوچ کے جمیل کا دماغ پاش پاش ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ جتنے وزنی پتھر

تھے، سب آپس میں ٹکرا ٹکرا کر چور چور ہو گئے ہیں۔

رات کو اس نے برانڈی کے تین پیگ پیے، تھوڑا سا ہلکا کھانا کھایا اور گزشتہ واقعات کے متعلق سوچتا سوچتا سو گیا۔

وہ ٹکڑے جو گم ہو گئے تھے ان کو تلاش کرنا اب جمیل کا شغل ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ اس روز ہوا، من و عن اس کی آنکھوں کے سامنے آجائے اور یہ روز روز کی مغز پاشی دور ہو — اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی بڑا قلق تھا کہ اس کا گناہ نامکمل رہ گیا۔ وہ سوچتا تھا یہ ادھورا گناہ جائے گا کس کھاتے میں۔ وہ چاہتا تھا کہ بس ایک دفعہ اس کی بھی تکمیل ہو جائے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود وہ پہاڑی بنگلوں جیسا مکان جمیل کی آنکھوں سے اوجھل رہا۔ جب وہ تھک ہار گیا تو اس نے ایک دن سوچا کیا یہ سب خواب ہی تو نہیں تھا!

مگر خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ خواب میں آدمی اتنے روپے تو خرچ نہیں کرتا — اس روز اس کے کم از کم ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے تھے۔

پیر صاحب سے اس نے نٹور کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ اس روز کے بعد دوسرے دن ہی سمندر پار کہیں چلا گیا ہے۔ غالباً موتیوں کے سلسلے میں۔ جمیل نے اس پر ہزار لعنتیں بھیجیں اور اپنی تلاش شروع کر دی۔

اس نے جب اپنے حافظے پر بہت زور دیا تو اسے بنگلے کی دیوار کے ساتھ پیتل کی ایک پلیٹ نظر آئی — اس پر کچھ لکھا تھا — غالباً — ڈاکٹر — ڈاکٹر بیرام جی — آگے جانے کیا —

ایک دن کولابہ کی گلیوں میں چلتے چلتے آخر وہ ایک ایسی گلی میں پہنچا جو اس کو جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ دو رویہ اسی قسم کی بنگلہ نما عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے باہر چھوٹے چھوٹے پیتل کے بورڈ لگے تھے۔ کسی پر چار کسی پر پانچ — کسی پر تین۔

وہ ادھر ادھر غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا، مگر اس کے دماغ میں وہ خط گھوم رہا تھا جو صبح اس کی ساس کی طرف سے موصول ہوا تھا کہ اب انتظار کی حد ہو گئی ہے۔ میں نے تاریخ مقرر کر دی ہے، آؤ اور اپنی دلہن کو لے جاؤ۔

اور وہ ادھر ایک نامکمل گناہ کو مکمل بنانے کی کوشش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ جمیل نے کہا ہٹاؤ جی اس وقت — پھر نے دو مارا مارا — ایک دم اس نے اپنے داہنے ہاتھ پیتل کا ایک چھوٹا سا بورڈ دیکھا — اس پر لکھا تھا — ڈاکٹر ایم بیرام جی — ایم ڈی۔

جمیل کانپنے لگا۔ یہ وہی بلڈنگ ـــــ بالکل ہی ـــ وہی رنگ، وہی بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیاں جمیل بے دھڑک اوپر چلا گیا۔ اس کے لئے اب ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ کوریڈور سے نکل کر اس نے سامنے والے دروازے پر دستک دی۔

ایک لڑکے نے دروازہ کھولا ـــــ اسی لڑکے نے جو اس روز سوڈا اور برف لایا تھا۔

جمیل نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے اس سے پوچھا: ''بیٹا، بائی جی ہیں؟''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا: ''جی ہاں!''

''جاؤ، ان سے کہو، صاحب ملنے آئے ہیں۔'' جمیل کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

لڑکا دروازہ بھیڑ کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور تارہ نمودار ہوئی۔ اس کو دیکھتے ہی جمیل نے پہچان لیا کہ وہی لڑکی ہے، مگر اب اس کی ناک پر پھنسی نہیں تھی۔ ''نمستے!''

''نمستے، کہیئے مزاج کیسے ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

جمیل نے جواب دیا: ''اچھے ہیں ـــــ میں پچھلے دنوں بہت مصروف رہا، اس لئے آ نہ سکا ـــــ کہو، پھر کیا ارادہ ہے؟''

تارہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا: ''معاف کیجیئے، میری شادی ہو چکی ہے۔''

جمیل بوکھلا گیا: ''شادی ـــــ کب؟''

تارہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا: ''جی، آج صبح ـــــ آیئے، میں آپ کو اپنے پتی سے ملاؤں''

جمیل چکرا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر کھٹا کھٹ نیچے اتر گیا ـــــ سامنے ٹیکسی کھڑی تھی۔

جمیل کا دل ایک لحظہ کے لئے ساکت سا ہو گیا۔ تیز قدم اٹھاتا، وہ بڑے بازار کی طرف نکل گیا۔

معاً جمیل کو جاتے دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے کہا: ''سیٹھ صاحب ٹیکسی!''

جمیل نے جھنجھلا کر کہا ـــــ ''نہیں کم بخت، شادی!''

شاردا

نذیر بلیک مارکیٹ سے وسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑے سے ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھاٹک سے کچھ ادھر سگریٹ والے کی دکان سے اس کو اسکوچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پئے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا: ”موسم دیکھ کتنا اچھا ہے۔“ پھر وہ اسے وہ بھونڈا سا شعر سنائے گا ؎

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور چخ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی، اور اس کے کہنے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دکان سے وہ بیس پچیس گز دور گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والے آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا: چنانچہ بڑے اخلاق سے کہا: ”کیوں بھئی، کہاں ہوتے ہو؟ کبھی نظر ہی نہیں آئے۔“

اس آدمی نے مسکرا کر کہا: ”حضور! میں تو یہیں ہوتا ہوں۔ آپ ہی کبھی تشریف، نہیں

لائے۔"

نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا: "میں اب جو تشریف لے آیا ہوں!"

"تو چلئے میرے ساتھ!"

نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا: "چلو!"

اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنیٰ خیز طریقے پر مسکرایا: "باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔"

یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے: "تمہارا نام کیا ہے؟"

"کریم — آپ بھول گئے تھے؟"

نذیر کو یاد آگیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لئے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔ بڑا ایماندار دلال تھا۔ اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔ کریم سے اس نے معذرت چاہی: "یار! میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے۔ غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔"

"جی ہاں:"

تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کا نا کا ہوا کرتا تھا!"

کریم نے بیڑی سُلگائی اور ذرا فخر سے کہا۔ "وہ میں نے چھوڑ دیا۔ آپ کی دعاء سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔" نذیر نے اُس کو داد دی "یہ بہت اچھا کام کیا ہے تم نے۔"

کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجے میں کہا: "دس چھوکریاں ہیں —— ایک بالکل نئی ہے"

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا: "تم لوگ یہی کہا کرتے ہو۔"

کریم کو برا لگا: "قسم قرآن کی میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سور کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو:" پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا: "آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پسنجر آیا تھا۔ جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو۔"

نذیر نے پوچھا: "کنواری تھی؟"

"جی ہاں —— دو سو روپے لئے تھے اس پسنجر سے۔"

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا: "لو، یہیں بھاؤ پکا کرنے لگے۔"

کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بری لگی: "قسم قران کی سور ہو جو آپ سے بھاؤ کرے آپ

تشریف لے چلیے۔ آپ جو بھی دیں گے، مجھے قبول ہوگا۔ کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔''

نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے۔ موسم اچھا تھا۔ موڈ بھی اچھا تھا۔ وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا۔ بن پیے مسرور تھا: ''چلو یار، آج تمام عیاشیاں رہیں — ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیے۔''

کریم نے پوچھا: ''آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟''

''پینتیس روپے میں''

''کون سا برانڈ ہے؟''

''جونی واکر۔''

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا: ''میں آپ کو تیس میں لا دوں گا۔''

نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیے: ''نیکی اور پوچھ پوچھ — یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی کرنا۔ تم جانتے ہو میں ایسے معاملوں پر اکیلا نہیں پیا کرتا۔''

کریم مسکرایا: ''اور آپ کو یاد ہوگا میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔''

نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا: ''آج دور ہیں!''

''جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں''

کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر ''میرینا ہوٹل'' لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی۔ سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سود خور پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کرسچن آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی۔ چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔ کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔ ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا۔ یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔

کریم نے آرام کرسی جو بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور نذیر سے کہا: ''تشریف رکھیے۔ لیکن میں یہ عرض کر دوں اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا''

نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا: "دس روپے زیادہ ہیں یار!"
کریم نے کہا: "بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔ اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پرواہ نہیں کرتے۔"
نذیر نے کچھ سوچ کر کہا: "تم ٹھیک کہتے ہو ــــ کرایہ پیشگی دے دوں؟"
"جی نہیں ــــــ آپ پہلے چھوکری تو دیکھئے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔ گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی۔ عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ خوش شکل تو نہیں تھی، لیکن بھولی بھالی تھی۔
کریم نے اس سے کہا: "بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں"
لڑکی نظریں نیچی کئے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم یہ کہہ کر چلا گیا: "اپنا اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب ــــــ میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔"
نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔ نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا: "آپ کا نام؟"
لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا:
"آپ کا نام کیا ہے جناب؟"
لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا: "شکنتلا"
اور نذیر کو شکنتلا یاد آ گئی جس پر راجہ دشینت عاشق ہوا تھا: "میرا نام دشینت ہے۔"
نذیر نِل عیاشی پر تلا ہوا تھا لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔ اتنے میں کریم آ گیا۔ اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں۔
"مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے۔ برف میں لگا ہوا لے کر آیا ہوں۔"
نذیر بہت خوش ہوا: تم کمال کرتے ہو۔" پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا: "جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟"
لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ کریم نے جواب دیا: "نذیر صاحب! یہ نہیں پیتی۔ آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے"
یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا: "یہ تو بہت بری بات ہے۔"
کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لئے ایک پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا:
"آپ راضی کر لیجئے اسے۔"

نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا۔ کریم نے آدھا پیگ پیا۔ فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلود ہوگئی۔ ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا: ''چھوکری پسند ہے نا آپ کو؟''

نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں۔ لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا۔ وہ شکنتلا جس پر راجہ دشینت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا، بہت ہی خوبصورت تھی۔ کم از کم کتابوں میں تو یہی درج تھا کہ وہ چندرے آفتاب چندرے ماہتاب تھی۔ آہو چشم تھی۔ نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بری نہیں تھی۔ آہو چشم تو نہیں تھی، لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔ کالی کالی اور بڑی بڑی۔ اس نے اور کچھ نہ سوچا اور کریم سے کہا: ''ٹھیک ہے یار —— بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟''

کریم نے آدھا پیگ اپنے لئے انڈیلا اور کہا: ''سو روپے!''

نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا: ''ٹھیک ہے!''

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا۔ نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔ نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہوئی۔ لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ زبردستی اس کو چوما۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے، اس لئے کہ شکنتلا بالکل الہڑ تھی۔ اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اناڑی تیراک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا: ''کیا بات ہے نذیر صاحب؟''

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا: ''کچھ نہیں یار، یہ اپنے کام کی نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

کچھ سمجھتی ہی نہیں''

کریم نے شکنتلا کو الگ لیجا کر بہت سمجھایا، مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا: ''میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔''

نذیر نے اس کو روکا۔ ''جانے دو —— کوئی اور لے آؤ۔'' لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا'' وہ جو تمہیں روپے دیئے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود

ہیں، انہیں یہاں بھیج دو——— میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!" کریم، نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں۔ نذیر نے ان سب کو سرسری نظر سے دیکھا کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لئے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دی۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی، دور ہو گئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگریٹ والے کی دکان سے خریدنے کی بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں لے دیگا۔ چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا: "نذیر صاحب! شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح کی گاڑی سے پہنچی ہے——— بہت ہٹیلی ہے۔ مگر آپ اس کو ضرور راضی کر لیں گے۔"

نذیر کچھ سوچ نہ سکا۔ اس نے اپنے دل میں اتنا کہا۔ "چلو دیکھ لیتے ہیں———" لیکن اس نے کریم سے کہا: "تم پہلے یا روسکی لے آؤ۔" یہ کہہ کر اس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیئے۔

کریم نے نوٹ لے کر نذیر سے کہا: "میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھئے"

نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے۔ لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنتلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا۔ جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹانگیں پلنگ پر رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی۔ کریم داخل ہوا۔ اس نے نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا۔ "نذیر صاحب! آ رہی ہے۔ لیکن آپ ہی رام کیجئے گا اسے"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل صورت قریب قریب شکنتلا سے ملتی تھی۔ تیوڑی چڑھائے، شکنتلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ بڑی بے پروائی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لیجا کر "آداب" کہا اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں

ڈ بکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا: ''آپ شکنتلا کی بہن ہیں؟''

اس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا: ''جی ہاں!''

نذیر تھوڑی دیر کے لیئے خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شکنتلا سے غالباً تین برس بڑی تھی، بڑے غور سے دیکھا نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی: ''آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی: ''جناب! آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں''

وہ برس پڑی ''میں ناراض کیوں نہ ہوں ——— یہ آپ کا کریم میری بہن کو جے پور سے اڑا لایا ہے۔ بتایئے آپ میرا خون نہیں کھولے گا مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟''

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا: ''شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں۔ بہت الھڑ ہے۔ مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔ آپ شاید برا مانیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں'' اس نے کچھ نہ کہا۔ ''نذیر نے اس سے دریافت کیا: ''آپ کا نام؟''

شکنتلا کی بڑی بہن نے مختصراً کہا: ''شاردا۔''

نذیر نے پھر اس سے پوچھا: ''آپ کا وطن؟''

''جے پور۔'' اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا۔

نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا: ''دیکھیئے، آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ——— کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں، لیکن میرا کوئی قصور نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا: ''یہ قصور البتہ میرا ہے۔ اس کی سزا میں بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔''

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔ غالباً گالیاں دینے والی تھی، لیکن چپ ہو گئی۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔ نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے۔ ''بتایئے، آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں''

وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ لڑکی اٹھی۔ نذیر نے اسے روکا: ''کہاں جا رہی ہیں آپ؟''

وہ ایک دم ماں بن گئی: ''منّی رو رہی ہے، دودھ کے لئے۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا۔ اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈے لے کر آ گیا۔ اس نے نذیر کے لئے سوڈا ڈالا۔ اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے رازدارانہ لہجے میں پوچھا: ''کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے —— میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹا لیا ہوگا۔'' نذیر نے مسکرا کر جواب دیا: ''بڑی غصیلی عورت ہے۔''

''جی ہاں —— صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی ہے۔ آپ ذرا اس کو رام کریں —— شکنتلا خود یہاں آئی تھی، اس لئے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے۔ اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا —— اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے —— آپ منا لیجئے نا اس کو!''

نذیر نے اس سے کہا: ''منانے کی کیا بات ہے!''

کریم نے اس کو آنکھ ماری: ''سالی مجھ سے تو مانتی نہیں۔ جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے۔''

اتنے میں شاردا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔ کریم کو غصے سے دیکھا۔ اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔

منّی کو بہت زکام تھا۔ ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی۔ نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کا نوٹ دے کر کہا: ''جاؤ ایک وکس کی بوتل لے آؤ!''

کریم نے پوچھا: ''وہ کیا ہوتی ہے؟''

نذیر نے اس سے کہا: ''زکام والی دوا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا: ''کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی۔''

''جی اچھا'' کہہ کر کریم چلا گیا۔ نذیر، منّی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ منّی خوش شکل نہیں تھی لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لئے دلکش تھی۔ اس نے اس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔ سر میں ہولے ہولے انگلیاں کر اس کو سلا دیا اور شاردا سے کہا: ''اس کی ماں تو میں ہوں۔''

شاردا مسکرائی: ''لائیے، میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔''

شاردا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی۔ اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار نہیں تھے۔ نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا: ''کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟''

اوراس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگالیا۔شاردا نے غصّے کا اظہار نہ کیا۔''جواب دیجئے جناب!''

شاردا خاموش رہی۔نذیر نے اٹھ کر ایک پیگ پیا تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا:
''مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔''

نذیر نے ایک پیگ گلاس ڈالا۔اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا:
''آپ کو اس سے نفرت ہے۔کیوں؟''

شاردا نے مختصر سا جواب دیا:''بس، ہے۔''

''تو آج سے نہیں رہے گی —— یہ لیجئے۔''یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

''میں ہرگز نہیں پیوں گی۔''

''میں کہتا ہوں، تم ہرگز انکار نہیں کرو گی۔''

شاردا نے گلاس پکڑلیا۔تھوڑی دیر تک عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غٹاغٹ پی گئی قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔دھوتی کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ کر اس نے نذیر سے کہا:''یہ پہلی اور آخری بار ہے۔لیکن میں نے کیوں پی؟'

نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا:''یہ مت پوچھو۔''یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔
کریم بہت خوش تھا۔اس نے نذیر سے کہا:'آپ نے کمال کر دیا —— آپ سے سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجئے!''

نذیر،شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔ وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فیصد صحیح جواب تھی۔اس نے کریم سے کہا:''میں کل ادا کردوں گا—— ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے۔''

کریم نے کہا:''کوئی واندہ نہیں ہے——میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملہ طے کرلیا—— حضور! میری جان کھا گئی تھی۔اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

کریم چلا گیا۔شاردا آئی—— اس کی گود میں منّی تھی۔نذیر نے اس کو پانچ روپے دیئے

لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔ اس پر نذیر نے اس سے مسکرا کر کہا: ''میں اس کا باپ ہوں۔ تم یہ کیا کر رہی ہو؟''

شاردا نے روپے لے لئے، بڑی خاموشی کے ساتھ۔ شروع شروع میں وہ بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہادے گی۔ مگر اب وہ بات کرنے سے گریز کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بچّی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا: ''لو بھئی شاردا، میں چلا۔ کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا۔''

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا۔ شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کئے۔ ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کو پینے کے لئے کہا تو وہ بولی: ''میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا''

نذیر اکیلا پیتا رہا۔ صبح گیارہ بجے سے وہ شام سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا — جب گھر لوٹا وہ بے حد مطمئن تھا۔ پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن شاردا اپنی واجبی شکل وصورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔ نذیر بار بار سوچتا تھا۔ ''یہ کیسی عورت ہے — میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش، مگر جسمانی طور پر ایسی پُرگو عورت نہیں دیکھی۔''

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نذیر ساٹھ روپے کریم کو دیتا تھا۔ دس روپے ہوٹل والا لے جاتا تھا۔ باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن وضع کر لیتا تھا۔ مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔ نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے بڑی شدّت سے محسوس کیا کہ شاردا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو رہی ہے۔ وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ٹھیک کمی محسوس ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے بجائے شاردا ہو۔ یہ بہت بری بات تھی۔ نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا، اس لئے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا ''شاردا! میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی، ختم ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا؛ حالانکہ چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں''

شاردا نے یہ سنا تو خاموش ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا: ''جتنے روپے میرے پاس

ہیں، آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجئے تاکہ میں شکنتلا کو لے کر واپس چلی جاؤں۔"

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا: "بکواس نہ کرو۔۔۔ تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہو گیا ہے، بلکہ یوں کہو کہ ختم ہو گیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا"

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لئے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اس کو بلایا۔ مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا: "آپ یہ روپے لے لیجئے ۔۔۔ اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجئے۔"

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیئے۔ شاردا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اس نے آداب عرض کیا اور کہا: "میں آج شام کو جے پور جا رہی ہوں۔"

نذیر نے پوچھا: "کیوں؟"

شاردا نے مختصر جواب دیا: "مجھے معلوم نہیں" اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

نذیر نے کریم سے کہا کہ اسے بلا کر لائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔

وہ چلی گئی، واقعی چلی گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا: "نذیر صاحب! آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟"

نذیر نے اس سے کہا: "بھائی میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں ۔۔۔ ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے تیس بوتل کے اور اوپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تو دیوالہ پٹ گیا ہے ۔۔۔ خدا کی قسم، مقروض ہو گیا ہوں۔"

یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا۔ نذیر نے اس سے کہا: "بھئی میں مجبور تھا۔ کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔"

کریم نے کہا: "نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی۔"

نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف

اس لئے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد منّی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے۔ کئی پسنجر آتے تھے۔ ایک رات کے دو دو سو روپے دینے کے لئے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا: ''تم کیا کر رہی ہو؟''

وہ جواب دیتی: ''اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔''

شاردا نے نذیر سے ایک بار اس کا فوٹو مانگا تھا جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا۔ یہ وہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی۔ اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا — جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔ نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی۔ لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق تھا، وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی۔ نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا کیونکہ وہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو گئی تھی۔ اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔ کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔ شاردا کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا، اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لا کر اسے دی۔ سارے خط وہی کھولا کرتی تھی ——— ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا: ''معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی'' نذیر نے خط لے کر دیکھا۔ اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ہندی ہے یا گجراتی۔ الگ ٹرے میں رکھ دیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔ وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا: ''ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔ تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔''

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا: ''ہندی ہے۔'' اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا: ''جے پور — پریئے نذیر صاحب۔'' اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔ نذیر چونکا۔ نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی۔ ''آداب۔ آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔ مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔''

نعیمہ کا رنگ سرخ ہو گیا۔ اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا۔ ''کوئی شاردا ہے۔''

نذیر اٹھا۔ جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا'' خدا معلوم کون ہے —— میں باہر جا رہا ہوں۔ اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوا لاؤں گا۔'' اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ ایک دوست کے پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبئی سنٹرل پر شاردا اس سے ملی تھی۔ اس کو اتنے بڑے مصوّر سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ

شام کو گھر آیا اس نے نیا خط اپنی بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنادی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا: ''عرصہ ہوا ہے، میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔ شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔ وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا۔ مصوّری کا اسے بھی شوق تھا۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔ اس کو بھی نذیر نے اسی طریقے سے گول کیا اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے، صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔ تین خط اس نے اس طرح وصول کئے۔ اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔ اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، لیکن خط اس اظہار سے پر ہوتے تھے۔ گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی۔ جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے، اس لئے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب کیا لکھے اس لئے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا، اور نذیر کہہ دیتا تھا: ''ٹھیک ہے!''

شاردا بمبئی آنے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو راز فاش ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوایا کہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے۔ ''میں کچھ دیر وہاں رہوں گی۔ اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آ جاؤں گی ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا۔''

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا۔ مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لئے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں، اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آرہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سٹپٹایا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک۔ اب روپے کے خرچ کا سوال نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی نہیں تھا اس نے سوچا: ''میں اپنے نوکر کو رازدار بنالوں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا۔''

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیئر میل آئی، مگر شاردا تلاش کے باوجود اسے نہ ملی۔ اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔

اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہالکشمی اترتا تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا: ''شاردا!''

شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا: ''نذیر صاحب!''

''تم یہاں کہاں؟''

شاردا نے شکایتاً کہا ''آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔''

نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا: ''تم یہاں ٹھہرو، میں دفتر سے چھٹی لے کر ابھی آتا ہوں''

شاردا کو بینچ پر بٹھا کر نذیر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر وہاں چپراسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی، لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا: ''تم نہالو، میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں''

شاردا نہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا ''کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کر دے اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پیگ جو دو کے برابر تھا گلاس میں انڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔

وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہا دھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کیں۔ نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔ وہ پہلے بہت کم گو تھی، اکثر خاموش رہتی تھی، مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔ نذیر نے سوچا "یہ محبت کیا ہے —— اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔ اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں۔ مگر اب اس کو جانے کیا ہو گیا ہے باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنا رہی ہے۔"

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر ناک بند کر کے وہ پیگ پی لیا۔ برا سا منہ بنایا۔ پانی لے کر کلّی کی۔ نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔ اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔ نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا۔ دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا۔ "تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔ لو، آ گئے ہیں پھر وہی دن، بلکہ راتیں بھی۔ ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں، صرف دن ہوتے تھے۔ ہوٹل کے میلے کچیلے دن۔ یہاں ہر چیز اجلی ہے۔ ہر چیز صاف ہے۔ ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں۔ کریم بھی نہیں۔ یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔"

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔ یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا۔ وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول فضول باتیں، گلے، شکوے، آہیں، راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔ نذیر نے ایک اور پیگ پیا اور سوچا "کون تارے گنتا ہے۔ گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو —— بالکل فضول ہے، بے ہودہ بکواس ہے۔"

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ بستر صاف تھا۔ شاردا صاف تھی۔ وہ خود صاف تھا۔ کمرے کی فضا بھی صاف تھی۔ لیکن کیا وجہ تھی نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔

نذیر نے سوچا شاید اس نے کم پی ہے۔ اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی دفعہ میں ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا۔ شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔ وہی ہجر و فراق کی باتیں۔ وہی گلے شکوے۔ نذیر اکتا گیا، اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا۔ اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے۔ اس کے جسم کے

جذبات کو اب وہ تیز نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ پھر بھی اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنی بیوی کے پاس۔ مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔ اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے۔

شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا، مگر وہ فضا نہیں تھی۔ وہ سودے بازی نہیں تھی۔ اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والی بات نہیں تھی ——— ہوٹل کی وہ غلاظت نہیں تھی۔ یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں۔ وہ نہیں تھا۔ نذیر اپنے گھر میں تھا۔ اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی۔ یہ احساس اس کے تحت الشعور میں تھا، اسی لئے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے۔ کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا۔ اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا اتنی دیر کے بعد ملی ہے، دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا، وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی جے پور میں تھی، ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لئے، اس کی پھنسیوں کے لئے، اس کے گلے کے لئے دوائیں منگوایا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔

ایک بار شاردا کی دودھ بھری چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے۔ اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا ماں بننا کتنا اچھا ہے ——— اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں۔ عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں کسی کو پالنا۔ اپنے بچے ہی کو سہی، کتنی شاندار چیز ہے۔"

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں۔ اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آب حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب وہ شاردا نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی، لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی

کشش یا جو کچھ تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگاتار اس کے ساتھ گزارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔ اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔ صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت کرنا شروع کر دی۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لئے ایک سویٹر بُن دیا۔ شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لئے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف تھرموس میں ڈالی ہوتی۔ صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی۔ پانی گرم کرا کے اس کو دیتی۔ وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کرتی۔ گھر کی صفائی کراتی۔ خود جھاڑو دیتی۔ نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے۔ مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے، اس لئے اکیلا سونا چاہتا ہے۔ شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔ مگر یہ نذیر کے لئے ایک اور الجھن ہو گئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی، اور وہ جاگتا رہتا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے —— کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے، مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے۔ آخر اس کا انجام کیا ہو گا —— محبت وغیرہ سب بکواس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات تھی، وہ اب نہیں رہی۔ اس کو واپس جے پور جانا چاہئے۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔ اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار گناہ کئے تھے مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے۔ اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔ شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہو گئی۔ وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا، مگر اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔ پورا ایک مہینہ ہو گیا۔ جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت الجھن ہوئی۔ "یہ عورت کیا پورا ایک مہینے یہاں رہی ہے —— میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں —— اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو ایک خط لکھتا ہوں جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں —— جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا فراڈ ہوں۔ ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا یا شاردا میں وہ پہلی سی بات

نہیں رہی؟

وہ اس کے متعلق سوچتا۔ مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہو گیا اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی۔ ''میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی۔ جب اس نے تار بھیجا، لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔''

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ رُوکھا ہو گیا۔ اس رُوکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہو گئی۔ اس نے نذیر کے آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔ لیکن نذیر کو اس کے اس رویّے سے بہت الجھن ہوئی۔ وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا اس لئے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا: ''بکواس نہ کرو، میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔

دفتر کے پاس کی دکان سے اس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے مگر ادھار مل گئے تھے، اس لئے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔ شام کو گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔ خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا کہ شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔ شاردا سے پوچھا: ''یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟''

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا: ''اندر الماری میں پڑا تھا۔''

نذیر نے کچھ نہ کہا۔ اس نے سوچا شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔ لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔ نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا: اندر الماری میں پڑا تھا۔'' نذیر نے بڑے غصّے کے ساتھ کہا: ''شاردا! تم بکواس کرتی ہو۔ تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا

ہوں۔ میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لئے ہر روز سگریٹ خریدا کرو"۔ شاردا نے بڑے پیار سے کہا: "آپ بھول جاتے ہیں، اسی لئے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔"

نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصّے سے کہا: "میرا دماغ خراب ہے —— لیکن مجھے یہ گستاخی ہرگز پسند نہیں"۔

شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا: "میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔"

نذیر نے ایک لحظے کے لئے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہئے، اس لئے کہ وہ، اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غدّاری کر رہا تھا، چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا: "بکواس نہ کرو میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپے درکار ہوں گے، دے دوں گا۔"

شاردا نے کچھ نہ کہا۔ رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی، مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھیں۔ پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بینک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا "میں بینک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔"

بینک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا، بالکل نزدیک تھا۔ وہ دو سو روپے نکلوا کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لے کر رخصت کر دے گا۔ مگر جب وہ گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اس نے پوچھا: "کہاں؟"

نوکر نے بتایا: "جی مجھ سے تو انہوں نے کچھ نہیں کہا —— اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں:"

نذیر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگریٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا!

(۳۱ جولائی ۱۹۵۰ء)

شُوشُو

گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ تمام کمرے لڑکے لڑکیوں، بچے بچیوں اور عورتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ شور برپا ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اگر اس کمرے میں دو تین بچے اپنی ماؤں سے لپٹے دودھ پینے کے لئے بلبلا رہے ہیں تو دوسرے کمرے میں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ڈھولکی لئے بے سری تانیں اڑا رہی ہیں۔ نہ تال کی خبر ہے نہ لے کی۔ بس گائے جا رہی ہیں۔ نیچے ڈیوڑھی سے لے کر بالائی منزل کی شہ نشینوں تک مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ کیوں نہ ہو۔ ایک مکان میں دو بیاہ رچے تھے میرے دونوں بھائی اپنی چاند سی دلہنیں بیاہ لائے تھے۔

رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ دونوں ڈولیاں آئیں اور گلی میں اس قدر شور برپا ہوا کہ الاماں۔ مگر وہ نظارہ بڑا روح افزا تھا۔ جب گلی کی سب شوخ و شنگ لڑکیاں باہر نکل آئیں اور تیتریوں کی طرح اِدھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگیں۔

ساڑیوں کی ریشمی سرسراہٹ، کلف لگی شلواروں کی کھڑ کھڑاہٹ اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہوا میں تیرنے لگی۔ تمتماتے ہوئے مکھڑوں پر بار بار گرتی ہوئی لٹیں ننھے ننھے سینوں پر زور دے کر نکالی ہوئی بلند آوازیں اونچی ایڑھی کے بوٹوں پر تھرکتی ہوئی ٹانگیں لچکتی ہوئی انگلیاں، دھڑکتے ہوئے لہجے پھڑکتی ہوئی رگیں اور پھر ان الھڑ لڑکیوں کی آپس میں سرگوشیاں! — یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ گلی کے پتھریلے فرش پر حسن و شباب اپنے قلم سے اپنے معانی لکھ رہا ہے۔

عباس میرے پاس کھڑا تھا۔ ہم دونوں عورتوں کے ہجوم میں گھرے تھے دفعتاً عباس

نے گلی کے نکڑ پر نظریں گاڑ کر کہا۔ ''شوشو کہاں ہے؟''

میں نے جواب دیا ''مجھے اس وقت تمہارے سوال کا جواب دینے کی فرصت نہیں ہے''

میں اس ہجوم میں اس بھنورے کی مانند کھڑا تھا جو پھولوں بھری کیاری دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کس پھول پر بیٹھے۔

عباس نے روتی آواز میں کہا ''وہ نہیں آئی''

''تو کیا ہوا — باقی تو سب موجود ہیں .... ارے .... دیکھو تو وہ نیلی ساڑی میں کون ہے؟ .... شوشو۔'' میں نے عباس کا ہاتھ دبایا۔

عباس نے غور سے دیکھا۔ ''نیلی ساڑی میں ....'' یہ کہہ کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہا ''علاج کراؤ اپنی آنکھوں کا — چغد کہیں کے، یہ شوشو ہے؟''

''کیوں وہ نہیں ہے کیا؟'' میں نے پھر نیلی ساڑی کی طرف غور سے دیکھا اور ایسا کرتے ہوئے میری نگاہیں ایکا ایکی اس لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ کچھ اس طور پر کہ اس کو ایک دھکا سا لگا۔ وہ سنبھلی اور فوراً ہی منہ سے لال جیبھ نکال کر میرا منہ چڑایا۔ اپنی سہیلی کے کان میں کچھ کہا۔

اس سہیلی نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا .... میرے ماتھے پر پسینہ آگیا عباس جو اپنا اطمینان کرنے کے لئے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بلند آواز میں کہا ''بخدا تم اس کی توہین کررہے ہو .... گدھے کہیں کے .... عورت کے معاملے میں نرے احمق ہو — کاٹھ کی کوئی پتلی نیلے رنگ میں لپیٹ لپاٹ کر تمہارے سامنے رکھ دی جائے۔ تم اسی کی بلائیں لینا شروع کردو گے''

یہ الفاظ اتنی اُونچی آواز میں ادا کیے گئے تھے کہ اس نیلی ساڑی والی نے سن لئے۔ جب وہ ہمارے پاس سے گزرنے لگی تو خود بخود ٹھٹھک گئی۔ ایک لحظہ کے لئے اس کے قدم رکے گویا ہم میں سے کسی نے اس کو مخاطب کیا ہے۔ پھر فوراً ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس احساس کی پیدا کی ہوئی خفت دور کرنے کے لئے اس نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا۔ ''ارے .... آمنہ تو کہاں اڑ گئی؟!''

مجھے موقع ملا میں نے جھٹ سے عباس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے اچھی طرح دبا کر اس سے کہا ''آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ مگر میرا نام محمد امین ہے — مجھے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں۔''

جل ہی تو گئی مگر ہم زیرِ لب مسکراتے آگے بڑھ گئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ عباس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا۔ ''شوشو ابھی تک نہیں آئی۔''

تو میں کیا کروں.......... میرے سر پر نمدہ باندھ دیجئے۔ تو میں ابھی سرکار کے لئے اسے تلاش کر کے لے آتا ہوں.......... آخر یہ کیا حماقت ہے بھئی تم تماشا بھی دیکھنے دو گے کہ نہیں؟.......... اور پھر جناب یہ تو بتائیے۔ اگر وہ یہاں موجود بھی ہو تو آپ اس سے ملاقات کیونکر کر سکتے ہیں.......... آپ کوئی امریکی ناول تو نہیں پڑھ رہے۔ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہے۔

عباس میری بات فوراً سمجھ گیا وہ اتنا بیوقوف نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھائے گلی سے نکل کر بازار میں چلے گئے۔ موڑ پر رام بھروسے پنواڑی کی دکان کھلی تھی وہ بجلی کے قمقمے کے نیچے سر جھکائے اونگھ رہا تھا۔ ہم نے اس سے دو پان بنوائے۔ اور وہیں بازار میں کرسیوں پر بیٹھ کر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ دیر تک ہم ہندوستان میں مرد عورت کے درمیان اجنبیت چلی آ رہی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے رہے جب ایک بج گیا تو عباس جمائی لے کر اٹھا اور کہنے لگا۔ ''بھئی اب نیند آ رہی ہے — اس حسرت کو ساتھ لئے جا رہا ہوں کہ شوشو کو نہ دیکھ سکا۔ سچ کہتا ہوں۔ امین وہ لڑکی.......... میں اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کیا ہے؟''

عباس نے اپنے گھر کا رُخ کیا اور میں نے اپنے گھر کا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ عباس نے شوشو جیسی معمولی لڑکی میں ایسی کون سی غیر معمولی چیز دیکھی ہے جو ہر وقت اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ عباس کے مذاق کے متعلق میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بڑا اونچا ہے مگر یہاں اسے کیا ہو گیا تھا؟.......... شوشو.......... شوشو..... ارے یہ کیا؟.......... دو تین بار اس کا نام میری زبان پر آیا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ پیپر منٹ کی گولیاں چوس رہا ہوں.......... شوشو.......... ایک دو مرتبہ آپ بھی اسے دہرائیے۔ ذرا جلدی جلدی.......... کیا آپ کو لذت محسوس ہوئی؟.......... ضرور ہوئی ہو گی۔ مگر کیوں؟ — سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں عباس کی محبوبہ شوشو کے بارے میں خواہ مخواہ کیوں غور کرنے لگا ہوں۔ اس میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو غور افروز ہو مگر.......... مگر یہ شوشو نام میں دلچسپی ضرور تھی اور کیا کہا تھا میں نے لذت بھی!''

شوشو میں بانجو کے تھرکتے ہوئے تاروں کی جھنکار سی پائی جاتی ہے۔ آپ یہ نام پکاریئے تو ایسا معلوم ہو گا کہ آپ نے کسی ساز کے تنے ہوئے تاروں پر زور سے گز پھیر دیا ہے

شوشو.......... شوشیلا کا دوسرا نام ہے یعنی اس کی بگڑی ہوئی شکل مگر اس کے باوجود اس میں کتنی موسیقی ہے.......... سوشیلا.......... شوشو — شوشو.......... سوشیلا.......... غلط

سوشیلا میں شوشو کی سی موسیقیت ہرگز نہیں ہو سکتی!''

فرنگی شاعر بائرن شکیل تھا مگر اس میں وہ کون سی شئے تھی جو عورتوں کے سینے میں ہیجان برپا کر دیتی تھی؟۔۔۔اس کا لنگڑا کر چلنا۔ گریٹا گاربو قطعاً خوش شکل نہیں ہے مگر اس میں کونسی چیز ہے جو فلمی تماشائیوں پر جادو کا کام کرتی ہے؟۔۔۔اس کا ذرا بگڑے ہوئے انگریزی لہجے میں باتیں کرنا .... یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات اچھی بھلی شئے کو بگاڑنے سے اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے؟ .... سوشیلا پندرہ سولہ برس کی ایک معمولی لڑکی ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ اس عمر میں وہ ان تمام چیزوں کی مالک ہے جو عام نوجوانوں کے سینے میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ مگر عباس کی نظروں میں یہ کوئی خوبی نہ تھی۔ عام نوجوان کی طرح عباس کا دل گھاس کی پتی کی مانند نہیں تھا۔ جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی کانپنا شروع کر دیتی ہے .... خدا جانے وہ اس کی کس ادا پر مرتا تھا جو میرے ذہن سے بالاتر تھی۔

میں نے سوشیلا کی شکل و صورت اور اس کی صناعانہ قدر و قیمت کے متعلق کبھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر نہ جانے میں اس روز اس کے متعلق کیوں سوچتا رہا۔ بار بار وہ میرے ذہن میں آ رہی تھی اور ہر بار میں سوشیلا کو چھوڑ کر اس کے مختصر نام شوشو کی موسیقی میں گم ہو جاتا تھا۔ انہی خیالات میں غرق گلی کے موڑ پر پہنچ گیا۔ اور مجھے اس چیز کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے دفعتاً وہاں کی فضا کو غیر معمولی طور پر خاموش پایا۔ مکان میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کے باہر گلی کی دیوار کے ساتھ ایک برقی قمقمہ لٹک رہا تھا جس کی چوندھیا دینے والی روشنی ساری گلی میں بکھری ہوئی تھی ...... مجھے اس قمقمے کے ''تجرّد'' پر بڑا ترس آیا۔ گلی بالکل سنسان تھی اور وہ قمقمہ متحیّر سا معلوم ہوتا تھا۔

گھر میں داخل ہوا تو وہاں بھی خاموشی تھی۔ البتہ کبھی کبھار کسی بچّے کے رونے کی لرزاں صدا اور پھر ساتھ ہی اس کی ماں کی خواب آلود آواز سنائی دیتی تھی۔ ڈیوڑھی کے ساتھ والا کمرہ کھول کر میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ پاس ہی تپائی پر ''رومان'' پڑا تھا۔ اس کو اٹھا کر میں نے ورق گردانی شروع کر دی۔ ورق الٹتے الٹتے اختر کی غزل پر نظریں جم گئیں۔ مطلع کس قدر حسین تھا۔

نہ بھولے گا ترا راتوں کو شرماتے ہوئے آنا
رسیلی انکھڑیوں سے نیند برساتے ہوئے آنا

مجھے نیند آ گئی۔ کلاک کی طرف دیکھا تو چھوٹی سوئی دو کے ہندسے کے پاس پہنچ چکی تھی اور اس کا اعلان کرنے کے لئے ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ٹن نن نن .... ٹن نن نن .... ن ا

دو بج گئے" .... میں اُٹھا اور سونے کے ارادے سے سیڑھیاں طے کر کے اپنی خوابگاہ میں پہنچا۔ بہار کے دن تھے۔ اور موسم خشک۔ میری خواب گاہ کی ایک کھڑکی باہر گلی کی طرف کھلتی ہے۔ جس کے پیازی رنگ کے ریشمی پردے میں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے بڑی پیاری لہریں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور سبز رنگ کا قمقمہ روشن کر کے بستر پر لیٹ گیا۔

میری پلکیں آپس میں ملنے لگیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں دھنکی ہوئی روئی کے بہت بڑے انبار میں دھنسا جا رہا ہوں۔ نیند اور بیداری کے درمیان صرف ایک لحظہ باقی رہ گیا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کے بولنے کے گنگناہٹ آئی اس پر ملتی ہوئی پلکیں کھل گئیں۔ اور میں نے غنودگی دور کرتے ہوئے غور سے سُننا شروع کیا ساتھ والے کمرے میں کوئی بول رہا تھا۔ یکایک کسی کی دل کش ہنسی کی مترنم آواز بلند ہوئی اور پھلجھڑی کے نورانی تاروں کے مانند پر سکوت فضا میں بکھر گئی۔

میں بستر سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑا ہو گیا

"دونوں دلہنیں ماشاء اللہ بڑی خوبصورت ہیں۔"

"چندے آفتاب، چندے ماہتاب"

غالباً دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں ان کے موضوع نے میری دلچسپی کو بڑھا دیا۔ اور میں نے زیادہ غور سے سُننا شروع کر دیا۔

تلے والی سرخ ساڑی میں نرگس کتنی بھلی معلوم ہوتی تھی .... گورے گورے گالوں پر بکھری ہوئی مقیش .... جی چاہتا تھا، بڑھ کر بلائیں لے لوں"۔

"بچاری کمٹی جا رہی تھی"۔

"سر تو اٹھایا ہی نہیں اس نے .... پر ...."

"پر یہ شرم و حیا کب تک رہے گی .... آج رات ...."

"آج رات!"

"اوئی اللہ .... تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ شوشو" اس کے ساتھ ہی کپڑے کی سرسراہٹ سنائی دی میرے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی ——— شوشو ——— تو ان میں سے ایک سوشیلا تھی ——— میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ اور میں نے دروازے میں کوئی دراڑ تلاش کرنا شروع کر دی کہ ان کی گفتگو سننے کے ساتھ ساتھ ان کو دیکھ بھی سکوں۔ ایک کواڑ کے نچلے تختے سے چھوٹی

سی گانٹھ نکل گئی تھی اور اس طرح چونّی کے برابر سوراخ پیدا ہو گیا تھا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر میں نے آنکھ جمادی۔

شوشو قالین پر بیٹھی بسکٹی رنگ کی ساڑی سے اپنی ننگی پنڈلی کو ڈھانک رہی تھی۔ اس کے پاس ہی عفت شرمائی ہوئی سی گاؤ تکیے پر دونوں کہنیاں ٹیکے لیٹی تھی۔

اس وقت ان گوری چٹی دلہنوں پر کیا بیت رہی ہوگی؟" شوشو یہ کہہ کر رک گئی اور اپنی آواز دبا کر اس نے عفت کی چوڑیوں کو چھیڑ کر ان میں کھنکھناہٹ پیدا کرتے کہا۔ "ذرا سوچو تو؟"

عفت کے گال ایک لمحے کے لئے تھرتھرائے۔ "کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شوشو۔"

جی ہاں — گویا ان باتوں سے دلچسپی ہی نہیں میری بنّو کو۔ بس میں ہو تو ابھی سے اپنی شادی رچالو۔"

عفت نے سوشیلا کی بات کاٹ دی۔ "پر یہ دلہنوں کو کہاں لے گئے ہیں شوشو؟"

"کہاں لے گئے ہیں؟ شوشو مسکرائی۔ سمندر کی تہہ میں جہاں جل پریوں کا راج ہے — کوہ قاف کے غاروں میں جہاں سینگوں والے جن رہتے ہیں —!"

چند لمحات کے لئے ایک پر اسرار سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد شوشو پھر بولی "کہاں لے گئے ہیں؟ .... لے گئے ہوں گے اپنے کمروں میں!"

"بیچاریوں کو نیند کیسے آئے گی؟" ایک لڑکی جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اور جس کا نام میں نہیں جانتا تھا۔ اپنا اندیشہ بیان کیا۔

شوشو کہنے لگی۔ "بے چاریاں .... کوئی ذرا ان کے دل سے جا کر پوچھے کہ ان کی آنکھیں اس رتجگے کے لئے کتنی بے قرار تھیں!"

"تو بہت خوش ہوں گی؟"

"اور کیا؟"

"پر میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ بہت ستایا کرتے ہیں؟" عفت سوشیلا کے پاس سرک آئی۔

"میں پوچھتی ہوں تمہیں اندیشہ کس بات کا ہو رہا ہے؟ .... جب تمہارے وہ ستانے لگیں گے تو نہ ستانے دینا انہیں .... ہاتھ پیر باندھ دینا ان کے .... ابھی سے فکر میں کیوں گھلی جا رہی ہو۔"

"ہائیں ہائیں" عفت نے تیزی سے کہا۔ "تم کیسی باتیں کر رہی ہو شوشو دیکھو میرا دل

کتنے زور سے دھڑکنے لگا ہے!" عفت نے سوشیلا کا ہاتھ اٹھا کر اپنے دل کے مقام پر رکھ دیا"۔
"کیوں؟"

شوشو نے عفت کے دل کی دھڑکنیں غور سے سنیں اور بڑے پراسرار لہجے میں کہا" جانتی ہو کیا کہہ رہا ہے؟"

عفت نے جواب دیا" نہیں تو؟"

"یہ کہتا ہے عفت بانو غزنوی دلہن بننا چاہتی ہے!........."

"ہٹاؤ جی لاج تو نہیں آتی تمہیں۔" عفت نے مسکرا کر کروٹ بدلی۔

"دل اپنا چاہتا ہے تمہارا اور خواہ مخواہ یہ سب کچھ میرے سر منڈھ رہی ہو" پھر یکا یک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور سوشیلا سے پوچھنے لگی۔" ہاں، یہ تو بتاؤ شوشو۔ تم بھلا کیسے آدمی سے شادی کرنا پسند کرو گی؟ — میرے سر کی قسم، سچ سچ بتاؤ، مجھی کو ہائے ہائے کرو۔ اگر جھوٹ بولو۔"

"میں کیوں بتاؤں" یہ کہہ کر سوشیلا نے تیزی سے اپنے سر کو حرکت دی۔ اور اس کا چہرہ نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ سامنے آ گیا، میں نے غور سے دیکھا وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوئی۔ آنکھیں مست تھیں اور ہونٹ تلوار کے تازہ زخم کے مانند کھلے ہوئے تھے۔ سر کے چند پریشان بال برقی روشنی سے منور فضا میں ناچ رہے تھے۔ چہرے کا گندمی رنگ نکھرا ہوا تھا۔ اور سینہ جس پر سے ساڑی کا پلو نیچے ڈھلک رہا تھا ہولے ہولے دھڑک رہا تھا چوڑے ماتھے پر سرخ بندیا بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔

عفت نے اصرار کیا۔" تمہیں میرے سر کی قسم بتاؤ؟"

شوشو نے کہا" پہلے تم بتاؤ"

"تو سنو، مگر کسی سے کہو گی تو نہیں۔" یہ کہہ کر عفت کچھ شرما سی گئی۔" میں چاہتی ہوں ......میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایک ایسے نوجوان سے ہو.........ایسے شوشو بولی۔

"توبہ اب کہہ بھی دو۔"

عفت نے پیشانی پر سے بال ہٹائے اور کہا۔ ہاں، ایسے نوجوان سے ہو۔ جس کا قد لمبا ہو۔ جسم بڑے بھائی کی طرح سڈول ہو۔ انگلینڈ ریٹرنڈ ہو انگریزی فرفر بولتا ہو — رنگ گورا اور نقش تیکھے ہوں۔ موٹر چلانا جانتا ہو اور بیڈ منٹن بھی کھیلتا ہو۔"

شوشو نے پوچھا" بس کہہ چکیں؟"

"ہاں" عفت نے نیم والیوں سے سوشیلا کی طرف مڑ کر دیکھنا شروع کیا" میری دعاء

ہے کہ پر ماتما تمہیں ایسا ہی پتی عطا فرمائیں۔'' سوشیلا کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا اور لہجہ ایسا تھا جیسے مندر میں کوئی مقدس منتر پڑھ رہی ہے۔

وہ لڑکی جو اس گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی تھی۔ بولی: ''عفت اب شوشو کی باری ہے۔''

عفت جو شوشو کی ساڑی کا ایک کنارہ پکڑ کر اپنی انگلی کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''بھئی اب تم بتاؤ۔ ہم نے تو اپنے دل کی بات تم سے کہہ دی۔''

شوشو نے جواب دیا '' سن کے کیا کرو گی؟.......... ''میرے خیالات تم سے بالکل مختلف ہیں۔''

''مختلف ہوں یا ملتے ہوں، پر ہم سنے بغیر تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''میں.......سوشیلا نے چھت کی طرف دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگی ''میں........ پر تم مذاق اڑاؤ گی عفت!''

''ارے.......تم سناؤ تو؟''

سوشیلا نے ایک آہ بھری۔'' میرے سپنے عجیب وغریب ہیں عفت .... یہ میرے دماغ میں صابن کے رنگ برنگے بلبلوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ناچ کر غائب ہو جاتے ہیں......... میں سوچتی ہوں .... اور پھر سوچتی ہوں کہ میں کیوں سوچا کرتی ہوں۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے اگر ہو جایا کرے تو کتنی اچھی بات ہے.......... لیکن پھر زندگی میں کیا رہ جائے گا......... خواہشیں اور تمنائیں کہاں سے پیدا ہوں گی .... ہم جس طرح جی رہے ہیں۔ ٹھیک ہے جانتی ہوں کہ جو کچھ مانگ رہی ہوں نہیں ملے گا۔ مگر دل میں مانگ تو رہے گی۔ کیا زندہ رہنے کے لئے یہی کافی نہیں؟''

عفت اور دوسری لڑکی خاموش بیٹھی تھیں۔

شوشو نے پھر کہنا شروع کیا'' میں اپنا جیون ساتھی ایک ایسے نوجوان کو بنانا چاہتی ہوں جو صرف عمر کے لحاظ سے جوان نہ ہو بلکہ اس کا دل، اس کا دماغ .... اس کا رواں رواں جوان ہو......... وہ شاعر ہو......... میں شکل وصورت کی قائل نہیں .... مجھے شاعر چاہئے جو میری محبت میں گرفتار ہو کر سر تا پا محبت بن جائے۔ جس کو میری ہر بات میں حسن نظر آئے .... جس کے ہر شعر میں میری اور صرف میری تصویر ہو......... جو میری محبت کی گہرائیوں میں گم ہو جائے۔ میں اسے ان تمام چیزوں کے بدلے میں اپنی نسوانیت کا وہ تحفہ دوں گی جو آج تک کوئی عورت نہ دے سکی۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ عفت حیرت کے مارے اس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سوشیلا کی گفتگو کا کوئی مطلب نہیں سمجھ سکی۔ میں خود متحیر تھا کہ پندرہ سولہ برس کی اس دبلی پتلی لڑکی کے سینے میں کیسے کیسے خیالات کروٹیں لے رہے ہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔

''اگر وہ مجھے نظر آجائے'' یہ کہہ کر سوشیلا آگے بڑھی اور عفت کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔ ''تو میں اس کے استقبال کے لئے بڑھوں اور اس کے ہونٹوں پر وہ بوسہ دوں جو ایک زمانے سے میرے ہونٹوں کے نیچے جل رہا ہے۔''

اور شوشو نے عفت کے حیرت سے کھلے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ جمادیئے ...... اور دیر تک ان کو جمائے رکھا۔ تعجب ہے کہ عفت بالکل ساکت بیٹھی رہی اور معترض نہ ہوئی۔

جب دونوں کے لب ایک مدھم آواز کے ساتھ جدا ہوئے اور ان کے چہرے مجھے نظر آئے تو ایک عجیب وغریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس کو الفاظ میں بیان ہی نہیں کر سکتے۔ عفت اس شہد کی مکھی کی طرح مسرور و متعجب معلوم ہوتی تھی جس نے پہلی مرتبہ پھول کی نازک پتیوں میں بیٹھ کر اس کا رس چوسنے کی لذت محسوس کی ہو............ اور سوشیلا...... وہ اور زیادہ پراسرار ہوگئی تھی۔

''آؤ! اب سوئیں۔''

یہ خواب آلود اور دھیمی آواز عفت کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دی۔ اور میں خیالات کے گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا۔

گندمی رنگ کی ننھی سی گڑیا، اپنے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے انوکھے خیالات کی پرورش کر رہی تھی .... اور وہ کون سا تحفہ اپنے دامنِ نسوانیت میں چھپائے بیٹھی تھی۔ جو آج تک کوئی عورت مرد کو پیش نہیں کر سکی؟ ....

میں نے سوراخ میں سے دیکھا شوشو اور عفت دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالی سو رہی تھیں۔ شوشو کے چہرے پر بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے سانس سے ان میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ وہ کس قدر تر وتازہ معلوم ہوتی تھی .... واقعی وہ اس قابل تھی کہ اس پر شعر کہے جائیں......... لیکن عباس تو شاعر نہیں تھا؟ .... پھر پھر .... !

عزّت کے لئے

چونی لال نے اپنی موٹر سائیکل اسٹال کے ساتھ روکی اور گدی پر بیٹھے بیٹھے صبح کے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ سائیکل رکتے ہی اسٹال پر بیٹھے ہوئے دونوں ملازموں نے اسے نمستے کہی تھی جس کا جواب چونی لال نے اپنے سر کی خفیف جنبش سے دے دیا تھا۔ سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر چونی لال نے ایک بندھے ہوئے بنڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اسے فوراً دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی بی ایس اے موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کیا اور یہ جا وہ جا۔

موڈرن نیوز ایجنسی قائم ہوئے پورے چار برس ہو چلے تھے۔ چونی لال اس کا مالک تھا۔ لیکن ان چار برسوں میں وہ ایک دن بھی اسٹال پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ ہر روز صبح اپنی موٹر سائیکل پر آتا، ملازموں کی نمستے کا جواب سر کی خفیف جنبش سے دیتا، تازہ اخباروں کی سرخیاں ایک نظر دیکھتا ہاتھ بڑھا کر بندھا ہوا بنڈل لیتا اور چلا جاتا۔

چونی لال کا اسٹال معمولی اسٹال نہیں تھا۔ حالانکہ امرتسر میں لوگوں کو انگریزی اور امریکی رسالوں اور پرچوں سے کوئی اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن موڈرن نیوز ایجنسی ہر اچھا انگریزی اور امریکی رسالہ منگواتی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ چونی لال منگواتا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھنے وڑھنے کا بالکل شوق نہیں تھا۔

شہر میں بہت کم آدمی جانتے تھے کہ موڈرن نیوز ایجنسی کھولنے سے چونی لال کا اصل مقصد کیا تھا۔ یوں تو اس سے چونی لال کو خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ وہ قریب قریب ہر بڑے اخبار کا ایجنٹ تھا۔ لیکن سمندر پار سے جو اخبار اور رسالے آتے بہت کم بکتے۔ پھر بھی ہر ہفتے

ولایت کی ڈاک کے موڈرن نیوز ایجنسی کے نام کئی خوبصورت بنڈل اور پیکٹ آتے ہی رہتے۔ اصل میں چونی لال یہ پرچے اور رسالے بیچنے کے لئے نہیں بلکہ مفت بانٹنے کے لئے منگواتا تھا۔ چنانچہ ہر روز صبح سویرے وہ ان ہی پرچوں کا بنڈل لینے آتا تھا جو اس کے ملازموں نے باندھ کر الگ رکھ چھوڑے ہوتے تھے۔

شہر کے جتنے بڑے افسر تھے سب چونی لال کے واقف تھے۔ بعض کی واقفیت صرف یہیں تک محدود تھی کہ ہر ہفتے ان کے یہاں جو انگریزی اور امریکی پرچے آتے ہیں، شہر میں کوئی ایک موڈرن نیوز ایجنسی ہے۔ اس کا مالک چونی لال ہے۔ وہ بھیجتا ہے۔ اور بل کبھی روانہ نہیں کرتا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کو معلوم تھا کہ چونی لال کا گھر بہت ہی خوبصورت ہے۔ ہے تو چھوٹا سا مگر بہت ہی نفیس طریقے پر سجا ہے۔ ایک نوکر ہے راما، بڑا صاف ستھرا اور سوفی صد سمجھ دار، معمولی سا اشارہ سمجھنے والا۔ جس کو صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ دوسرے کیا کرتے ہیں کیا نہیں کرتے اس سے اس کو دلچسپی نہیں۔ چونی لال گھر پر موجود ہو جب بھی ایک بات ہے موجود نہ ہو جب بھی ایک بات۔ مہمان کس غرض سے آیا ہے --- یہ اس کو اس کی شکل دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوگی کہ اس سے سوڈے برف کے لئے کہا جائے یا پانوں کا آرڈر دیا جائے۔ ہر چیز خود بخود وقت پر مل جائے گی اور پھر تاک جھانک کا کوئی خدشہ نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی کھٹکا نہیں کہ بات کہیں باہر نکل جائے گی۔ چونی لال اور اس کا نوکر راما دونوں کے ہونٹ دریا کے دریا پینے پر بھی خشک رہتے تھے۔

مکان بہت ہی چھوٹا تھا۔ بمبئی اسٹائل کا۔ یہ چونی لال نے خود بنوایا تھا۔ باپ کی وفات پر اسے دس ہزار روپیہ ملا تھا جس میں سے پانچ ہزار اس نے اپنی چھوٹی بہن روپا کو دے دیئے تھے اور جدّی مکان بھی اور خود علیحدہ ہو گیا تھا۔ روپا اپنی ماں کے ساتھ اس میں رہتی تھی۔ اور چونی لال الگ اپنے بمبئی اسٹائل کے مکان میں۔ شروع شروع میں ماں بہن نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ رہے، ساتھ نہ رہے تو کم از کم ان سے ملتا ہی رہے، مگر چونی لال کو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی ماں اور بہن سے نفرت تھی۔ دراصل اسے شروع ہی سے ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ باپ سے ضرور تھی کہ وہ تھانیدار تھا۔ لیکن جب وہ ریٹائر ہوا تو چونی لال کو اس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جس وقت اسے کالج میں کسی سے کہنا پڑتا کہ اس کے والد ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر ہیں تو اسے بہت کوفت ہوتی۔

چونی لال کو اچھی پوشش اور اچھے کھانے کا بہت شوق تھا۔ طبیعت میں نفاست تھی۔

چنانچہ وہ لوگ جو اس کے مکان میں ایک دفعہ بھی گئے، اس کے سلیقے کی تعریف اب تک کرتے ہیں۔ این ڈبلیو آر کے ایک نیلام میں اس نے ریل کے ڈبے کی ایک سیٹ خریدی تھی۔ اس کو اس نے اپنے دماغ سے بہت ہی عمدہ دیوان میں تبدیل کروالیا تھا۔ چونی لال کو یہ اس قدر پسند تھا کہ اسے اپنی خوابگاہ میں رکھوایا ہوا تھا۔

شراب اس نے کبھی چھوئی نہیں تھی لیکن دوسروں کو پلانے کا بہت شوق تھا۔ ایرے غیرے کو نہیں، خاص الخاص آدمیوں کو جن کی سوسائٹی میں اونچی پوزیشن ہو، جو کوئی مرتبہ رکھتے ہوں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی وہ اکثر دعوت کرتا۔ کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں نہیں اپنے گھر میں جو اس نے خاص اپنے لئے بنوایا تھا۔

زیادہ پینے پر اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اسے کسی تردد کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ چونی لال کے پاس ایسی چیزیں ہر وقت موجود رہتی تھیں جن سے نشہ کم ہو جاتا تھا۔ ڈر کے مارے کوئی گھر نہ جانا چاہے تو علیحدہ سجے سجائے دو کمرے موجود تھے--- چھوٹا سا ہال تھا اس میں کبھی کبھی مجرے بھی ہوتے تھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ چونی لال کے اس مکان میں اس کے دوست کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں اپنی سہیلیوں سمیت رہے۔ لیکن اس نے ان کو مطلق خبر نہ ہونے دی کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ البتہ جب اس کا کوئی دوست اس کی ان نوازشوں کا شکریہ ادا کرتا تو چونی لال غیر متوقع طور پر بے تکلف ہو کر کہتا: "کیا کہتے ہو یار--- مکان تمہارا اپنا ہے۔" عام گفتگو میں وہ اپنے دوستوں کے اونچے مرتبے کے پیش نظر ایسا بے تکلف کبھی نہیں ہوتا تھا۔

چونی لال کا باپ لالہ گردھاری لال عین اس وقت ریٹائر ہوا جب چونی لال تھرڈ ڈویژن میں انٹرنس پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ پہلے تو یہ تھا کہ صبح شام گھر پہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ڈالیوں پر ڈالیاں آ رہی ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ تنخواہ تو بس سیدھی بینک چلی جاتی تھی، لیکن ریٹائرڈ ہونے پر کچھ ایسا پانسہ پلٹا کہ لالہ گردھاری لال کا نام جیسے بڑے آدمیوں کے رجسٹر ہی سے کٹ گیا۔ یوں تو جمع پونجی کافی تھی، لیکن لالہ گردھاری لال نے بے کار مباش کچھ کیا کر، مکانوں کا سٹہ کھیلنا شروع کر دیا، اور دو برسوں ہی میں آدھی سے زیادہ جائیداد گنوا دی۔ پھر لمبی بیماری نے آ گھیرا۔ ان تمام واقعات کا چونی لال پر عجیب و غریب اثر ہوا۔ لالہ گردھاری کا حال پتلا ہونے کے ساتھ چونی لال کے دل میں اپنا پرانا ٹھاٹ اور اپنی پرانی ساکھ قائم رکھنے کی خواہش بڑھتی گئی اور آخر میں اس کے ذہن نے آہستہ آہستہ کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ وہ بڑے آدمیوں کا بظاہر ہم

جلیس، ہم پیالہ وہم نوالہ تھا، لیکن اصل میں وہ ان سے بہت دور تھا۔ ان کے رتبے سے، ان کی جاہ ومنزلت سے البتہ اس کا وہی رشتہ تھا جو ایک بت سے پجاری کا ہوتا ہے یا ایک آقا سے ایک غلام کا۔

ہوسکتا ہے کہ چونی لال کے وجود کے کسی گوشے میں بہت ہی بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی جو وہیں کی وہیں دب گئی اور یہ صورت اختیار کر گئی جو اب اس کے دل ودماغ میں تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ جو کچھ بھی وہ کرتا، اس میں انتہائی درجے کا خلوص تھا۔ کوئی بڑا آدمی اس سے ملے نہ ملے، یہی کافی تھا کہ وہ اس کے دیئے ہوئے امریکی اور انگریزی پرچے ایک نظر دیکھ لیتا ہے۔

فسادات ابھی شروع نہیں ہوئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقسیم کی بات بھی ابھی نہیں چلی تھی کہ چونی لال کی بہت دنوں کی مراد پوری ہوتی نظر آئی۔ ایک بہت ہی بڑے افسر تھے جس سے چونی لال کی جان پہچان نہ ہوسکتی تھی۔ ایک دفعہ اس کے مکان پر شہر کی سب سے خوبصورت طوائف کا مجرا ہوا۔ چند دوستوں کے ہمراہ اس بڑے افسر کا شرمیلا بیٹا ہربنس بھی چلا آیا۔ چنانچہ جب چونی لال کی اس نوجوان سے دوستی ہوگئی تو اس نے سمجھا کہ ایک نہ ایک دن اس کے باپ سے بھی راہ ورسم پیدا ہو ہی جائے گی۔

ہربنس جس نے تعیش کی زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا بہت ہی الھڑ تھا۔ چونی لال خود تو شراب نہیں پیتا تھا لیکن ہربنس کا شوق پورا کرنے کے لئے اور اسے شراب نوشی کے ادب آداب سکھانے کے لئے ایک دو دفعہ اسے بھی پینی پڑی۔ لیکن بہت ہی قلیل مقدار میں۔۔۔

لڑکے کو شراب پینی آگئی تو اس کا دل کسی اور چیز کو چاہا۔ چونی لال نے یہ بھی مہیا کر دی اور کچھ اس انداز سے کہ ہربنس کو جھینپنے کا موقع نہ ملنے دیا۔

جب کچھ دن گزر گئے تو چونی لال کو محسوس ہوا کہ ہربنس ہی کی دوستی کافی ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ لوگوں کی سفارشیں کرالیتا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنے لئے کبھی کسی سے سفارش نہیں کرائی تھی۔ اس کو شوق تھا دوسروں کے کام کرنے اور انھیں اپنا ممنوں احسان بنانے کا، بلکہ یوں کہئے کہ ان کے دل ودماغ پر کچھ ایسے خیالات طاری کرنے کا کہ بھئی کمال ہے۔۔۔ ایک معمولی سی نیوز ایجنسی کا مالک ہے لیکن بڑے بڑے حاکموں تک اس کی رسائی ہے۔ بعض یہ سمجھتے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن چونی لال حقیقت میں جو کچھ تھا بہت ہی کم آدمی جانتے تھے۔

ایک کو خوش کیجئے تو بہت سوں کو ناراض کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ چونی لال کے جہاں احسان مند تھے وہاں دشمن بھی تھے اور اس تاک میں رہتے تھے کہ موقع ملے اور اس سے بدلہ لیں۔

فسادات شروع ہوئے تو چونی لال کی مصروفیات زیادہ ہوگئیں۔۔۔ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے لئے اس نے کام کیا، لیکن صرف ان ہی کے لئے جن کا سوسائٹی میں کوئی درجہ تھا۔ اس کے گھر کی رونق بھی بڑھ گئی۔ قریب قریب ہر روز ہی کوئی نہ کوئی سلسلہ رہتا۔ اسٹور روم جو سیڑھیوں کے نیچے تھا شراب اور بیئر کی خالی بوتلوں سے بھر گیا تھا۔

ہربنس کا الھڑپن اب بہت حد تک دور ہو چکا تھا۔ اب اسے چونی لال کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے آدمی کا لڑکا تھا۔ فسادات نے دستر خوان بچھا کر نت نئی چیزیں اس کے لئے چن دی تھیں۔ چنانچہ قریب قریب ہر روز وہ چونی لال کے مکان میں موجود ہوتا۔

رات کے بارہ بجے ہوں گے چونی لال اپنے کمرے میں ریل گاڑی کی سیٹ سے بنائے ہوئے دیوان پر بیٹھا اپنے پستول کو انگلی پر گھمارہا تھا کہ دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ چونی لال چونک پڑا اور سوچنے لگا۔۔ بلوائی؟۔۔ نہیں!۔۔ راما؟۔۔ نہیں! وہ تو کئی دنوں سے کرفیو کے باعث نہیں آرہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ہربنس کی سہمی ہوئی ڈری ہوئی آواز۔۔ چونی لال نے دروازہ کھولا۔ ہربنس کا رنگ ہلدی کے گابھے کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ تک پیلے تھے۔ چونی لال نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ۔۔۔وہ۔۔۔“ آواز ہربنس کے سوکھے ہوئے گلے میں اٹک گئی۔ چونی لال نے اس کو دلاسا دیا۔ ”گھبرایئے نہیں۔۔۔ بتایئے کیا ہوا ہے؟“ ہربنس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”وہ۔۔۔وہ۔۔۔ لہو بند ہی نہیں ہوتا!“

چونی لال سمجھا تھا کہ شاید مر گئی ہے۔ چنانچہ یہ سن کر اسے ناامیدی سی ہوئی۔ لیکن وہ لاش کو ٹھکانے لگانے کی پوری اسکیم اپنے ہوشیار دماغ میں تیار کر چکا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کے گھر میں اس کے مہمان کسی مشکل میں گرفتار ہو جائیں تو چونی لال کا دماغ غیر معمولی طور پر مستعد ہو جاتا تھا۔ مسکرا کر اس نے ہربنس کی طرف دیکھا جو کہ لرز رہا تھا۔ ”میں سب ٹھیک کیے دیتا ہوں آپ گھبرایئے نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے اس کمرے کا رخ کیا جس میں ہربنس تقریباً سات بجے سے ایک لڑکی کے ساتھ جانے کیا کرتا رہا تھا۔ چونی لال نے ایک دم بہت سی باتیں سوچیں۔ ڈاکٹر۔۔ نہیں بات باہر نکل جائے گی۔ ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا سوال ہے اور یہ سوچتے ہوئے اسے عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس ہوئی کہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کے ننگ و ناموس کا محافظ ہے۔

راما؟ ـــ کرفیو کے باعث وہ کئی دنوں سے نہیں آرہا تھا ـــ برف؟ ـــ ہاں برف ٹھیک ہے۔ ریفریجریٹر موجود تھا ـــ لیکن سب سے بڑی پریشانی چونی لال کو یہ تھی کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ایسے معاملوں سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن اس نے سوچا کچھ بھی ہو کوئی نہ کوئی اوپائے نکالنا ہی پڑے گا۔

چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ ساگوان کے اسپرنگوں والے پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی تھی اور سفید چادر خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ چونی لال کو بہت گھن آئی لیکن وہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ''بھیا!''

چونی لال نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ ''روپا!'' اور اس کے دماغ میں اوپر تلے سینکڑوں باتوں کا انبار سا لگ گیا۔ ان میں سب سے ضروری بات یہ تھی کہ ہربنس کو پتہ نہ چلے کہ روپا اس کی بہن ہے۔ چنانچہ اس نے منہ پر انگلی رکھ کر روپا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور باہر نکل کر معاملے پر غور کرنے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا۔

دہلیز میں ہربنس کھڑا تھا۔ اس کا رنگ اب پہلے سے بھی زرد تھا۔ ہونٹ بالکل بے جان ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ چونی لال کو دوبدو دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

چونی لال نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ہربنس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔

چونی لال خاموش تھا۔ اس کے چہرے کا کوئی خط بگڑا ہوا نہیں تھا۔ اصل میں وہ سارے معاملے پر غور کر رہا تھا۔ اس قدر تعمق سے غور کر رہا تھا کہ وہ ہربنس کی موجودگی سے بھی غافل تھا۔ مگر ہربنس کو چونی لال کی غیر معمولی خاموشی میں اپنی موت دکھائی دے رہی تھی۔ چونی لال اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو ہربنس زور سے چیخا اور دوڑ کر اس میں داخل ہوا۔ بہت ہی زور سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریل گاڑی کی سیٹ والے دیوان پر سے پستول اٹھایا اور باہر نکل کر چونی لال کی طرف تان دیا۔

چونی لال پھر بھی کچھ نہ بولا۔ وہ ابھی تک معاملہ سلجھانے میں مستغرق تھا۔ سوال ایک بہت بڑے آدمی کی عزت کا تھا۔

پستول ہربنس کے ہاتھ میں کپکپانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد فیصلہ ہو جائے، لیکن وہ اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتا تھا۔ دونوں چونی لال اور ہربنس کچھ دیر خاموش رہے ـــ لیکن ہربنس زیادہ دیر تک چپ نہ رہ سکا۔ اس کے دل و دماغ میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک دم اس نے بولنا شروع کیا۔ ''میں ـــ میں ـــ مجھے کچھ معلوم نہیں ـــ یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے

---اس مسلمان سب انسپکٹر کی --- کیا نام ہے اس کا محمد طفیل ---ہاں ہاں محمد طفیل --- نہیں نہیں ---بشیر احمد --- نہیں محمد طفیل ---وہی طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی ۔---اس نے مجھے یہ لڑکی لا کر دی اور کہا مسلمان ہے --- مجھے معلوم ہوتا تمہاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا --- تم --- تم --- تم بولتے کیوں نہیں ۔" اور اس نے چلانا شروع کر دیا۔ "تم بولتے کیوں نہیں --- تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو --- "تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو --- لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا--- مجھے کچھ معلوم نہیں تھا--- مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔"

چونی لال نے ہولے سے کہا۔ "گھبرایئے نہیں --- آپ کے پتا جی کی عزت کا سوال ہے ۔" لیکن ہربنس چیخ چلا رہا تھا۔ اس نے کچھ نہ سنا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستول داغ دیا۔ تیسرے روز کرفیو ہٹنے پر چونی لال کے دو نوکروں نے موڈرن نیوز ایجنسی کا اسٹال کھولا۔ تازہ اخبار اپنی اپنی جگہ پر رکھے۔ چونی لال کے لئے اخباروں اور رسالوں کا ایک بنڈل باندھ کر الگ رکھ دیا مگر وہ نہ آیا۔

کئی راہ چلتے آدمیوں نے تازہ اخباروں کی سرخیوں پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم کیا کہ موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ منہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔

عورت ذات

مہاراجہ گ سے ریس کورس پر اشوک کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد دونوں بے تکلف دوست بن گئے۔

مہاراجہ گ کو ریس کے گھوڑے پالنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا۔ اس کے اصطبل میں اچھی سے اچھی نسل کا گھوڑا موجود تھا اور محل میں جس کے گنبد ریس کورس سے صاف دکھائی دیتے تھے طرح طرح کے عجائب موجود تھے۔

اشوک جب پہلی بار محل میں گیا تو مہاراجہ گ نے کئی گھنٹے صرف کر کے اس کو اپنے تمام نوادر دکھائے۔ یہ چیزیں جمع کرنے میں مہاراجہ کو ساری دنیا کا دورہ کرنا پڑا تھا۔ ہر ملک کا کونہ کونہ چھاننا پڑا تھا۔ اشوک بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اس نے نوجوان مہاراجہ گ کے ذوق انتخاب کی خوب داد دی۔

ایک دن اشوک گھوڑوں کے ٹپ لینے کے لئے مہاراجہ کے پاس گیا تو وہ ڈارک روم میں فلم دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشوک کو وہیں بلوالیا۔ سکسٹین ملی میٹر فلم تھی جو مہاراجہ نے خود اپنے کیمرے سے عکس بند کی تھی۔ جب پروجیکٹر چلا تو پچھلی ریس پوری کی پوری پردے پر دوڑ گئی۔ مہاراجہ کا گھوڑا اس ریس میں ون آیا تھا۔

اس فلم کے بعد مہاراجہ نے اشوک کی فرمائش پر اور کئی فلم دکھائے۔ سوئزرلینڈ! پیرس، نیویارک، ہونولولو، ہوائی، وادیٔ کشمیر ----- اشوک بہت محظوظ ہوا۔ یہ فلم قدرتی رنگوں میں تھے۔

اشوک کے پاس بھی سکسٹین ملی میٹر کیمرہ اور پروجیکٹر تھا۔ مگر اس کے پاس فلموں کا

استاذ خیرہ نہیں تھا۔ دراصل اس کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ اپنا یہ شوق جی بھر کے پورا کر سکے۔

مہاراجہ جب کچھ فلم دکھا چکا تو اس نے کیمرے میں روشنی کی اور بڑی بے تکلفی سے اشوک کی ران پر دھپا مار کر کہا۔۔۔۔ "اور سناؤ دوست"

اشوک نے سگریٹ سلگایا۔ "مزا آ گیا فلم دیکھ کر۔"

"اور دکھاؤں"

"نہیں نہیں!"

"نہیں بھئی ایک ضرور دیکھو۔۔۔۔ مزا آجائے گا تمہیں۔" یہ کہہ کر مہاراجہ نے ایک صندوقچہ کھول کر ایک ریل نکالی اور پروجیکٹر پر چڑھا دی۔ "ذرا اطمینان سے دیکھنا۔"

اشوک نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

مہاراجہ نے کمرے کی لائٹ اوف کر دی۔ "مطلب یہ کہ ہر چیز غور سے دیکھنا" یہ کہہ کر اس نے پروجیکٹر کا سوئچ دبا دیا۔

پردے پر چند لمحے صرف سفید روشنی تھرتھراتی رہی، پھر ایک دم تصویریں شروع ہو گئیں۔ ایک الف ننگی عورت صوفے پر لیٹی تھی۔ دوسری سنگار میز کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔

اشوک کچھ دیر خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔۔۔ اس کے بعد ایک دم اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکلی مہاراجہ نے ہنس کر اس سے پوچھا "کیا ہوا؟"

اشوک کے حلق سے آواز پھنس پھنس کر باہر نکلی۔ "بند کرو یار بند کرو۔"

"کیا بند کرو؟"

اشوک اٹھنے لگا مگر مہاراجہ گ نے اسے پکڑ کر بیٹھا دیا۔۔۔۔ "یہ فلم تمہیں پورے کا پورا دیکھنا پڑے گا۔"

فلم چلتا رہا۔ پردے پر برہنگی منہ کھولے ناچتی رہی۔ مرد اور عورت کا جنسی رشتہ مادر زاد عریانی کے ساتھ تھرکتا رہا۔ اشوک نے سارا وقت بے چینی میں کاٹا۔ جب فلم بند ہوا اور پردے پر صرف سفید روشنی تھی تو اشوک کو ایسا محسوس ہوا کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا پروجیکٹر کی بجائے اس کی آنکھیں پھینک رہی ہیں۔

مہاراجہ گ نے کمرے کی لائٹ اون کی اور اشوک کی طرف دیکھا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا۔۔۔۔ "کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

اشوک کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ایک دم روشنی ہونے کے باعث اس کی آنکھیں بھینچی ہوئی

تھیں۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ مہاراجہ گ نے زور سے اس کی ران پر دھپا مارا اور اس قدر بے تحاشا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اشوک صوفے پر سے اٹھا رومال نکال کر اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ''کچھ نہیں یار۔''

''کچھ نہیں کیا ---- مزا نہیں آیا۔''

اشوک کا حلق سوکھا ہوا تھا۔ تھوک نگل کر اس نے کہا۔ ''کہاں سے لائے یہ فلم؟''

مہاراجہ نے صوفے پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔ ''پیرس سے ---- پے ری ---- پے ری!''

اشوک نے سر کو جھٹکا سا دیا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''کیا؟''

''یہ لوگ ---- میرا مطلب ہے۔ کیمرہ کے سامنے یہ لوگ کیسے............؟''

''یہی تو کمال ہے ---- ہے کہ نہیں؟''

''ہے تو سہی''۔ یہ کہہ کر اشوک نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ ''ساری تصویریں جیسے میری آنکھوں میں پھنس سی گئی ہیں۔''

مہاراجہ اٹھا۔ ''میں نے ایک دفعہ چند لیڈیز کو یہ فلم دکھایا۔''

اشوک چلّایا۔ ''لیڈیز کو؟''

''ہاں ہاں ---- بڑے مزے لے لے کر دیکھا انہوں نے۔''

''غلط۔''

مہاراجہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''سچ کہتا ہوں ---- ایک دفعہ دیکھ کر دوسری دفعہ پھر دیکھا۔ چیختی چلاتی اور ہنستی رہیں۔''

اشوک نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا۔ ''حد ہو گئی ہے ---- میں تو سمجھتا تھا وہ بے ہوش ہو گئی ہوں گی۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن انہوں نے خوب لطف اٹھایا۔''

اشوک نے پوچھا۔ ''کیا یوروپین تھیں؟''

مہاراجہ نے کہا۔ ''نہیں بھائی ---- اپنے دیس کی تھیں ---- مجھ سے کئی بار یہ فلم اور پروجیکٹر مانگ کر لے گئیں ---- معلوم نہیں کتنی سہیلیوں کو دکھا چکی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اشوک.......... '' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا؟''

''ایک دو روز کے لئے یہ فلم دے سکتے ہو مجھے؟''

''ہاں ہاں لے جاؤ!'' یہ کہہ کر مہاراجہ نے اشوک کی پسلیوں میں ٹھونکا دیا۔

''سالے کس کو دکھائے گا''

''دوستوں کو''

''دکھا جس کو بھی تیری مرضی!'' یہ کہہ کر مہاراجہ گ نے پروجیکٹر سے فلم کا اسپول نکالا۔ اس کو دوسرے اسپول پر چڑھا دیا اور ڈبہ اشوک کے حوالے کر دیا۔

''لے پکڑ ۔۔۔۔۔ عیش کر!''

اشوک نے ڈبہ ہاتھ میں لے لیا تو اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ گھوڑوں کے ٹپ لینا بھول گیا اور چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔

گھر سے پروجیکٹر لے جا کر اس نے کئی دوستوں کو یہ فلم دکھایا۔ تقریباً سب کے لئے انسانیت کی یہ عریانی بالکل نئی چیز تھی۔ اشوک نے ہر ایک کا رد عمل نوٹ کیا۔ بعض نے خفیف سے گھبراہٹ اور فلم کا ایک ایک انچ غور سے دیکھا، بعض نے تھوڑا سا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ بعض آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود فلم کو تمام وکمال طور نہ دیکھ سکے ایک برداشت نہ کر سکا اور اٹھ کر چلا گیا۔

تین چار روز کے بعد اشوک کو فلم لوٹانے کا خیال آیا تو اس نے سوچا۔ کیوں نہ اپنی بیوی کو دکھاؤں۔ چنانچہ وہ پروجیکٹر اپنے گھر لے گیا۔ رات ہوئی تو اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ دروازے بند کئے۔ پروجیکٹر کا کنکشن وغیرہ کیا ۔۔۔۔ فلم نکالا۔ اس کو فٹ کیا کمرے کی بتی بجھائی اور فلم چلا دیا۔

پردے پر چند لمحات سفید روشنی تھرتھرائی، پھر تصویریں شروع ہوئیں۔ اشوک کی بیوی زور سے چیخی، تڑپی، اچھلی اس کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکلیں۔ اشوک نے اسے پکڑ کر بٹھانا چاہا تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور چیخنا شروع کر دیا ۔۔۔۔ ''بند کرو ۔۔۔۔ بند کرو۔''

اشوک نے ہنس کر کہا۔ ''ارے بھئی دیکھ لو ۔۔۔۔ شرماتی کیوں ہو''

''نہیں نہیں'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا۔

اشوک نے اس کو زور سے پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ جو اس کی آنکھوں پر تھا ایک طرف کھینچا۔ اس کھینچا تانی میں دفعتاً اشوک کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ اشوک کے بریک سی لگ گئی۔ اس نے تو محض تفریح کی خاطر اپنی بیوی کو فلم دکھایا تھا۔

روتی اور بڑبڑاتی اس کی بیوی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اشوک چند لمحات بالکل خالی

اللہ بن بیٹھا ننگی تصویریں دیکھتا رہا، جو حیوانی حرکات میں مشغول تھیں۔ پھر ایک دم اس نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کیا۔ اس احساس نے اسے خجالت کے سمندر میں غرق کر دیا---- اس نے سوچا مجھ سے بہت ہی نازیبا حرکت سرزد ہوئی۔ لیکن حیرت ہے کہ مجھے اس کا خیال تک نہ آیا---- دوستوں کو دکھایا تھا---- ٹھیک تھا---- گھر میں اور کسی کو نہیں، اپنی بیوی---- اپنی بیوی کو...... اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

فلم چل رہا تھا۔ مادرزاد برہنگی مختلف آسن اختیار کرتی دوڑ رہی تھی۔ اشوک نے اٹھ کر سوچ اوف کر دیا۔ پردے پر سب کچھ بجھ گیا۔ مگر اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔ اس کا دل و دماغ شرمساری میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ احساس اس کو چبھ رہا تھا کہ اس سے ایک نہایت ہی نازیبا---- نہایت ہی واہیات حرکت سرزد ہوئی ہے۔ اس نے یہاں تک سوچا کہ وہ کیسے اپنی بیوی سے آنکھ ملا سکے گا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ایک سگریٹ سلگا کر اس نے احساس ندامت کو مختلف خیالوں کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دیر دماغ میں ادھر ادھر ہاتھ مارتا رہا۔ جب چاروں طرف سے سرزنش ہوئی تو بیچ بچا ہو گیا اور ایک عجیب سی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی کہ جس طرح کمرے میں اندھیرا ہے اسی طرح اس کے دماغ پر بھی اندھیرا چھا جائے۔

بار بار اسے یہ چیز ستا رہی تھی۔ ''ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ......'' پھر وہ سوچتا۔ ''بات اگر ساس تک پہنچ گئی، سالیوں کو پتہ چل گیا۔ میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے یہ لوگ کہ ایسے گرے ہوئے اخلاق کا آدمی نکلا---- ایسی گندی ذہنیت کہ اپنی بیوی کو......''

تنگ آکر اشوک نے سگریٹ سلگایا۔ وہ ننگی تصویریں جو وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگیں۔ ان کے عقب میں اسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آتا۔ حیران و پریشان، جس نے زندگی میں پہلی بار عفونت کا اتنا بڑا ڈھیر دیکھا ہو، سر جھٹک کر اشوک اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس سے بھی اس کا اضطراب دور نہ ہوا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلا۔ ساتھ والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی بیوی منہ سر لپیٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جا کر مناسب اور موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگے۔ مگر خود میں اتنی جرأت پیدا نہ کر سکا۔ دبے پاؤں لوٹا اور اندھیرے کمرے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ دیر تک جاگتا رہا۔ آخر سو گیا۔

صبح سویرے اٹھا۔ رات کا واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔ اشوک نے بیوی سے

ملنا مناسب نہ سمجھا اور ناشتہ کئے بغیر نکل گیا۔

آفس میں اس دن دل لگا کر اس نے کوئی کام نہ کیا۔ یہ احساس اس کے دل ودماغ کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ ''ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا۔''

کئی بار اس نے گھر بیوی کو ٹیلی فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار نمبر کے آدھے ہندسے گھما کر ریسیور رکھ دیا۔ دوپہر کو گھر سے جب اس کا کھانا آیا تو اس نے نوکر سے پوچھا

''میم صاحب نے کھانا کھالیا؟''

نوکر نے جواب دیا۔ ''جی نہیں۔'' ----- وہ کہیں باہر گئے ہیں۔''

''کہاں؟''

''معلوم نہیں صاحب!''

''کب گئے تھے!''

''گیارہ بجے۔''

اشوک کا دل دھڑکنے لگا۔ بھوک غائب ہو گئی۔ دو چار نوالے کھائے اور ہاتھ اٹھالیا۔ اس کے دماغ میں ہلچل مچ گئی۔ طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ ''گیارہ بجے ابھی تک لوٹی نہیں ----- گئی کہاں ہے ----- ماں کے پاس؟ کیا وہ اسے سب کچھ بتا دے گی؟ ----- ضرور بتائے گی۔ ماں سے بیٹی سب کچھ کہہ سکتی ہے ----- ہو سکتا ہے. بہنوں کے پاس گئی ہو ----- سنیں گی تو کیا کہیں گی؟ ----- دونوں میری کتنی عزت کرتی تھیں۔ جانے بات کہاں سے کہاں پہنچے گی ----- ''ایسی واہیات حرکت اور مجھے خیال تک نہ آیا -----''

اشوک آفس سے باہر نکل گیا۔ موٹر لی اور ادھر ادھر آوارہ چکر لگاتا رہا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے موٹر کا رخ گھر کی طرف پھیر دیا۔ ''دیکھا جائے گا جو کچھ ہو گا۔''

گھر کے پاس پہنچا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جب لفٹ ایک دھچکے کے ساتھ اوپر اٹھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے منہ میں آگیا۔

لفٹ تیسری منزل پر رکی۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے دروازہ کھولا۔ اپنے فلیٹ کے پاس پہنچا تو اس کے قدم رک گئے۔ اس نے سوچا کہ لوٹ جائے۔ مگر فلیٹ کا دروازہ کھلا اور اس کا نوکر بیڑی پینے کے لئے باہر نکلا۔ اشوک کو دیکھ کر اس نے بیڑی ہاتھ میں چھپالی اور سلام کیا۔ اشوک کو اندر داخل ہونا پڑا۔

نوکر پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اشوک نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔ ''میم صاحب کہاں ہیں۔''

نوکر نے جواب دیا۔ ''اندر کمرے میں!''

''اور کون ہے؟''

''ان کی بہنیں صاحب—— کولابے والے صاحب کی میم صاحب اور دو پارسی بائیاں!''

یہ سن کر اشوک بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکا دیا۔ اندر سے اشوک کی بیوی کی پتلی مگر تیز آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

نوکر بولا۔ ''صاحب''

اندر کمرے میں ایک دم گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چیخیں بلند ہوئیں۔ دروازوں کی چٹخنیاں کھلنے کی آوازیں آئیں۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ ہوئی۔ اشوک کوری دوڑ سے ہوتا پچھلے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ پروجیکٹر چل رہا ہے اور پردے پر دن کی روشنی میں دھندلی دھندلی انسانی شکلیں ایک نفرت انگیز میکانکی یک آہنگی کے ساتھ حیوانی حرکات میں مشغول ہیں۔

اشوک بے تحاشا ہنسنے لگا۔

(۴ر جون ۱۹۵۰ء)

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان
گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی۔ ان کو وہ عام گفتگو میں
ستعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اس نے اپنی
پڑوسن طمنچہ جان سے کہا: ''دس لیف، ویری بَیڈ......'' یعنی یہ زندگی بہت بُری ہے جبکہ کھانے ہی کو
کچھ نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی
کر اس کے پاس آتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے
پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی
نک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان
سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ
ر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی: ''صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔'' اور اگر وہ اس سے
ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ
یرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی: ''صاحب، تم ایک دم اُلو کا پٹھا
ہے، حرامزادہ ہے...... سمجھا!'' یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے
اتھ ان سے باتیں کرتی —— گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو بالکل اُلو کے پٹھے
کھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی، ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں ——— اس کے پاس صرف چھ آدمی آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے، خدا جھوٹ نہ بلوائے، ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔ تین روپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا تھا: ''بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے.....'' جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا، چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا: ''دیکھو، میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک ڈھیلا تم کم کہو تو نہ ہوگا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔'' چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھیر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا: ''لایئے ایک روپیہ دودھ کا۔'' اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے، غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ——— بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گئے ہیں، یہ زنجیر اسی لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر پانی ایک دم اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹو گرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا: ''کیا ہوا......؟ یہ چیخ تمہاری تھی......؟''

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا: ''یہ موا پیخانہ ہے یا کیا ہے۔ بیچ میں یہ ریل

گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا، میں نے کہا، چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں......''

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی۔ چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہوگئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا، اس لیے اس نے عورت کو پیشے پر بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے، وہ اس کی تلاش میں آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا۔ عورت چونکہ ضعیف الاعتقاد تھی، اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا۔ چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی۔ چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں، دس پندرہ اچھی اچھی ساڑیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آگیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس

نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سلطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دو کانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں، اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوتی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی ——— ''یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے۔'' یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کر لی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں ''کوئلوں کی دکان'' لکھا تھا، وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں 'شرفا کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے'' لکھا تھا وہاں اس کی دوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی، اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی اس نے خدا بخش سے کہا: ''کیا بات ہے خدا بخش، پورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا...... مانتی ہوں، آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے......''

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا: ''میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے

ہیں...... یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ......" وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا۔ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ، کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو ـــــ اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں، آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا: "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے...... یہاں کیا دھرا ہے......؟" بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے، اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے......"

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا: "نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔"

سلطانہ چپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ بچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیہ کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال واسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک بھک بھک سدا گونجتی رہتی تھی۔ صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اٹھتا دکھائی دیتا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے، دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے...... نہ جانے کہاں؟ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کہیں رک جائے گی، کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا۔

یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور ٹھیرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اُٹھ رہا ہے، ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر ڈھکیلتے رہتے ہیں ——— سلطانہ کو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خدا بخش سے اس نے بارہا کہا:

"دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔" مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی: "جانِ من! میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں ہی بیڑا پار ہو جائے گا......"

پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرّم کا مہینہ سر پر آ رہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیض بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرّم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی۔ پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو وہ باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

سامنے پٹریوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے، پر انجن کوئی بھی نہ تھا —— شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا، اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹریوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے

کے لیے کہا: ''آپ اوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے؟''

وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا: ''تمہیں کیسے معلوم ہوا...... ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟''

اس پر سلطانہ نے کہا: ''یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے......''

وہ یہ سن کر پھر مسکرایا: ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے...... میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھیر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے......'' یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سلطانہ نے پوچھا: ''آپ جا رہے ہیں؟''

اس آدمی نے جواب دیا: ''نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں...... چلو، مجھے تمام کمرے دکھاؤ......''

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا: ''میرا نام شنکر ہے......''

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیض تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا: ''فرمائیے......!''

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا: ''میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے......''

جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا: ''میں سمجھا...... لو اب مجھ سے سنو۔ جو کچھ تم نے سمجھا ہے، غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے......''

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی: ''آپ کام کیا

کرتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا: ''یہی جو تم لوگ کرتے ہو!''

''کیا؟''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''میں...... میں...... میں کچھ بھی نہیں کرتی۔''

''میں بھی کچھ نہیں کرتا۔''

سلطانہ نے بھنّا کر کہا: ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی...... آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے؟''

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: ''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی؟''

''میں جھک مارتی ہوں......''

''میں بھی جھک مارتا ہوں......''

''تو آؤ، دونوں جھک ماریں......''

''حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔''

''ہوش کی دوا کرو...... یہ لنگر خانہ نہیں......''

''اور میں بھی والنٹیئر نہیں......''

سلطانہ اب رک گئی۔ اس نے پوچھا: ''یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا: ''الّو کے پٹھے......''

''میں الّو کی پٹھی نہیں......''

''مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے، ضرور الّو کا پٹھا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے......'' یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔

اس پر سلطانہ نے کہا: ''تم ہندو ہو، اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اُڑاتے ہو......''

شنکر مسکرایا: ''ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔''

''جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو...... بولو، رہو گے؟''

''اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں......''

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی: ''تو جاؤ، رستہ پکڑو......''

شنکر آرام سے اٹھا، پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا۔ ''میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو، بلا لینا...... بہت کام کا آدمی ہوں۔''

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا: ''تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟''

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: ''پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں......''

''کچھ انھوں نے تم سے کہا؟''

''نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے...... پر سلطانہ، میں جو ان کی خدمت کر رہا ہوں، وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

سلطانہ کے دماغ میں محرّم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی: ''تم سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو...... میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں، نہ آ سکتی ہوں۔ محرّم سر پر آ گیا ہے۔ کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ، کیا ہو گا...... یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا......''

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا: ''پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے...... خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب یہ برداشت نہیں ہو

سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ پر جو کرتا ہے، اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے، کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم......"

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: "تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیض پڑی ہے، اس کو میں رنگوالوں گی۔ سفید نیلون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لاکر دیا تھا۔ یہ بھی قمیض کے ساتھ ہی رنگوالیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کردو...... دیکھو، تمہیں میری جان کی قسم! کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو...... میری بھتی کھاؤ، اگر نہ لاؤ......"

خدا بخش اٹھ بیٹھا: "اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جارہی ہو...... میں کہاں سے لاؤں گا...... افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں......"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے......"

"تم کچھ نہیں کرو گے...... تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کرسکتے ہو...... جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی، اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا: "لو، اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی تو خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی، کچھ دیر سوئی رہی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کمروں میں ٹہلتی رہی ـــــ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نیلون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیض نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں جن میں اس کے دیکھے ہوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی ـــــ اب شام ہوگئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔

نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدّت ہوگئی مگر

سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے تانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔

جب شنکر اوپر آ گیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے دراصل اس نے ایسی ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا: ''تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ...... میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔''

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی: ''نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے......''

شنکر اس پر مسکرا دیا: ''تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔''

''کیسی شرطیں؟'' سلطانہ نے ہنس کر کہا: ''کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟''

''نکاح اور شادی کیسی؟ نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں...... چھوڑو ان فضولیات کو، کوئی کام کی بات کرو......''

''بولو، کیا بات کروں؟''

''تم عورت ہو...... کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے......''

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی: ''صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو......''

''جو دوسرے چاہتے ہیں۔''

شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا......''

''تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں، خود سمجھنا چاہئیں......''

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا: ''میں سمجھ گئی......''

''تو کہو، کیا ارادہ ہے......''

تم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔''

"تم غلط کہتی ہو...... اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو...... تمہارا نام سلطانہ ہے نا؟"

"سلطانہ ہی ہے......"

شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا: "میرا نام شنکر ہے...... یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ، اندر چلیں......"

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا: "شنکر، میری ایک بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا: "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی: "تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر......"

"کہو کہو...... رک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا: "بات یہ ہے کہ محرّم آ رہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں...... یہاں کے سارے دکھڑے تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیض اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے......"

شنکر نے یہ سن کر کہا: "تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم کالی شلوار بنوا سکو۔"

سلطانہ نے فوراً ہی کہا: "نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔"

شنکر مسکرایا: "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا۔ محرّم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی...... لو، بس اب خوش ہو گئیں نا! پھر سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر اس نے پوچھا: "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا: "تم ان کا کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا: "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں، ان کی قیمت نہیں پوچھی۔ بولو دیتی ہو......"

''لے لو......'' یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔ پھر اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا: ''ساٹن کی کالی شلوار ہے...... دیکھ لینا شاید لمبی ہو...... اب میں چلتا ہوں......''

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ویسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا، اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیض اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا ''قمیض اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے...... کب بنوائی؟''

سلطانہ نے جواب دیا: ''آج ہی درزی لایا ہے......'' یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں: ''یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟''

مختار نے جواب دیا: ''آج ہی منگوائے ہیں......''

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

ممّی

نام اس کا مسز سٹیلا جیکسن تھا مگر سب اسے ممی کہتے تھے۔ درمیانے قد کی ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کا خاوند جیکسن پچھلی سے پچھلی جنگ عظیم میں مارا گیا تھا اس کی پنشن سٹیلا کو قریب قریب دس برس سے مل رہی تھی۔

وہ پونہ میں کیسے آئی، کب سے وہاں تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ دراصل میں نے اس کے محل وقوع کے متعلق کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی دلچسپ عورت تھی کہ اس سے مل کر سوائے اس کی ذات سے اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی تھی۔ اس سے کون وابستہ ہے، اس کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پونہ کے ہر ذرّے سے وابستہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ ایک حد تک مبالغہ ہو، مگر پونہ میرے لئے وہی پونہ ہے، اور اس کے وہی ذرّے، اس کے تمام ذرّے ہیں جن کے ساتھ میری چند یادیں منسلک ہیں —— اور ممی کی عجیب و غریب شخصیت ان میں سے ہر ایک میں موجود ہے۔

اس سے میری پہلی ملاقات پونہ ہی میں ہوئی.................. میں نہایت سست الوجود انسان ہوں۔ یوں تو سیر و سیاحت کی بڑی بڑی امنگیں میرے دل میں موجود ہیں، آپ میری باتیں سنیں تو آپ سمجھیں گا کہ میں عنقریب کنچن جنگا یا ہمالہ کی اسی قسم کے نام کی کسی چوٹی کو سر کرنے کے لئے نکل جانے والا ہوں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ زیادہ اغلب ہے کہ میں یہ چوٹی سر کر کے وہیں کا ہو رہوں۔

خدا معلوم کتنے برس سے بمبئی میں تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جب پونہ گیا

تو بیوی میرے ساتھ تھی۔ ایک لڑکا ہو کر اس کو مرے قریب قریب چار برس ہو چکے تھے۔ اس دوران میں.........ٹھہریے میں حساب لگا لوں.........آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آٹھ برس سے بمبئی میں تھا۔ مگر اس دوران میں مجھے وہاں کا وکٹوریہ گارڈنز اور میوزیم دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔

یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں ایک دم پونہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جس فلم کمپنی میں ملازم تھا، اس کے مالکوں سے ایک نکمی سی بات پر دل میں ناراضی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ یہ تکدر دور کرنے کے لئے پونہ ہو آؤں۔ وہ بھی اس لئے کہ پاس تھا اور وہاں میرے چند دوست رہتے تھے۔

مجھے پربھات نگر جانا تھا، جہاں میرا فلموں کا ایک پرانا ساتھی رہتا تھا۔ اسٹیشن کے باہر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کافی دور ہے۔ مگر اس وقت ہم تانگہ لے چکے تھے۔ ست رو چیزوں سے میری طبیعت سخت گھبراتی ہے مگر میں اپنے دل سے کدورت دور کرنے کے لئے آیا تھا، اس لئے مجھے پربھات نگر پہنچنے میں کوئی عجلت نہیں تھی تانگہ بہت واہیات قسم کا تھا۔ علی گڑھ کے اکوں سے بھی زیادہ واہیات۔ ہر وقت گرنے کا خطرہ رہتا ہے۔ گھوڑا آگے چلتا ہے اور سواریاں پیچھے۔ ایک دو گردے اٹے ہوئے بازار افتاں وخیزاں طے ہوئے تو میری طبیعت گھبرا گئی۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ اس نے کہا کہ دھوپ تیز ہے۔ میں نے جو اور تانگے دیکھے ہیں، وہ بھی اسی قسم کے ہیں۔ اگر اسے چھوڑ دیا تو پیدل چلنا ہو گا جو ظاہر ہے کہ اس سواری سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میں نے اس سے اختلاف مناسب نہ سمجھا ——— دھوپ واقعی تیز تھی۔

گھوڑا ایک فرلانگ آگے بڑھا ہو گا کہ پاس سے اسی ہونق ٹائپ کا ایک تانگہ گزرا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا۔ ایک دم کوئی چیخا "اوئے منٹو کے گھوڑے!"

میں چونک پڑا۔ چڈہ تھا۔ ایک گھسی ہوئی میم کے ساتھ۔ دونوں ساتھ ساتھ جڑ کے بیٹھے تھے۔ میرا پہلا ردعمل انتہائی افسوس کا تھا کہ چڈے کی جمالیاتی حس کہاں گئی جو ایسی لال لگامی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عمر کا ٹھیک اندازہ تو میں نے اس وقت نہیں کیا تھا مگر اس عورت کی جھریاں پاؤڈر اور روج کی تہوں میں سے بھی صاف نظر آ رہی تھیں۔ اتنا شوخ میک اپ تھا کہ بصارت کو سخت کوفت ہوتی تھی۔

چڈے کو ایک عرصے کے بعد میں نے دیکھا تھا۔ وہ میرا بے تکلف دوست تھا۔ "اوئے منٹو کے گھوڑے" کے جواب میں یقیناً میں نے بھی کچھ اسی قسم کا نعرہ بلند کیا ہوتا، مگر اس عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر میری ساری بے تکلفی ٹھٹھر یاں ہو گئی۔

میں نے اپنا تانگہ رکوالیا۔ چڈے نے بھی اپنے کوچوان سے کہا کہ ٹھہر جائے۔ پھر اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر انگریزی میں کہا: ''ممی! جسٹ اے منٹ'' تانگے سے کود کر وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے چیخا ''تم ——— تم یہاں کیسے آئے؟'' پھر اپنا بڑھا ہوا ہاتھ بڑی بے تکلفی سے میری پر تکلف بیوی سے ملاتے ہوئے کہا ''بھابی جان ——— آپ نے کمال کر دیا ——— اس گل محمد کو آخر آپ کھینچ کر یہاں لے ہی آئیں۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

چڈے نے اونچے سرور میں کہا: ''ایک کام سے جا رہا ہوں ——— تم ایسا کرو، سیدھے''.......... وہ ایک دم پلٹ کر میرے تانگے والے سے مخاطب ہوا: ''دیکھو، صاحب کو ہمارے گھر لے جاؤ ——— کرایہ ورایہ مت لینا ان سے۔'' ادھر سے فوراً ہی فارغ ہو کر اس نے نمٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا: ''تم جاؤ۔ نوکر وہاں ہوگا ——— باقی تم دیکھ لینا۔''

اور وہ پھدک کر اپنے تانگے میں اس بوڑھی میم کے ساتھ بیٹھ گیا جس کو اس نے ممی کہا تھا۔ اس سے مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ بوجھ جو ایک دم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر میرے سینے پر آ پڑا تھا کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

اس کا تانگہ چل پڑا۔ میں نے اپنے تانگے والے سے کچھ نہ کہا۔ تین یا چار فرلانگ چل کر وہ ایک ڈاک بنگلہ نما قسم کی عمارت کے پاس رکا اور نیچے اتر گیا: ''چلئے صاحب..........'' میں نے پوچھا: ''کہاں؟'' اس نے جواب دیا: ''چڈہ صاحب کا مکان یہی ہے۔''

''اوہ'' میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے تیوروں نے مجھے بتایا کہ وہ چڈے کے مکان کے حق میں نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو وہ پونہ ہی کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو یقین تھا کہ مجھے وہاں پینے پلانے والے دوست مل جائیں گے۔ تکدر دور کرنے کا بہانہ پہلے ہی سے موجود ہے، اس لئے دن رات اُڑے گی ——— میں تانگے سے اتر گیا۔ چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا، وہ میں نے اٹھایا اور اپنی بیوی سے کہا: ''چلو!''

وہ غالباً میرے تیوروں سے پہچان گئی تھی کہ اسے ہر حالت میں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا؛ چنانچہ اس نے حیل وحجت نہ کی اور خاموش میرے ساتھ چل پڑی۔

بہت معمولی قسم کا مکان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری والوں نے عارضی طور پر ایک چھوٹا بنگلہ بنایا تھا، تھوڑی دیر اسے استعمال کیا اور چھوڑ کر چلتے بنے۔ چونے اور گچ کا کام بڑا کچا تھا۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور گھر کا اندرونی حصہ ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک بے پروا کنوارے کا

ہو سکتا ہے جو فلموں کا ہیرو ہو، اور ایسی کمپنی میں ملازم ہو جہاں ماہانہ تنخواہ ہر تیسرے مہینے ملتی ہے، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔

مجھے اس کا پورا احساس تھا کہ وہ عورت جو بیوی ہو، ایسے گنجے ماحول میں یقیناً پریشانی اور گھٹن محسوس کرے گی، مگر میں نے سوچا تھا کہ چڈہ آ جائے تو اس کے ساتھ ہی پربھات نگر چلیں گے۔ وہاں جو میرا فلموں کا پرانا ساتھی رہتا تھا، اس کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ وہاں کے ماحول میں میری بیوی قہر درویش بر جان درویش دو تین دن گزار سکتی تھی۔

نوکر بھی عجیب لاابالی آدمی تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو سب دروازے کھلے تھے مگر وہ موجود نہیں تھا۔ جب آیا تو اس نے ہماری موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا، جیسے ہم سالہا سال سے وہیں بیٹھے تھے، اور اسی طرح بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جب وہ کمرے میں داخل ہو کر ہمیں دیکھے بغیر پاس سے گزر گیا تو میں سمجھا کہ شاید کوئی معمولی ایکٹر ہے جو چڈہ کے ساتھ رہتا ہے پر جب میں نے اس سے نوکر کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ذات شریف چڈہ صاحب کے چہیتے ملازم تھے۔

مجھے اور میری بیوی، دونوں کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس سے پانی لانے کو کہا تو وہ گلاس ڈھونڈنے لگا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے ایک ٹوٹا ہوا مگ الماری کے نیچے سے نکالا اور بڑبڑایا: ''رات ایک درجن گلاس صاحب نے منگوائے تھے، معلوم نہیں کدھر گئے''۔

میں نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شکستہ مگ کی طرف اشارہ کیا: ''کیا آپ اس میں تیل لینے جا رہے ہیں۔''

تیل لینے جانا بمبئی کا ایک خاص محاورہ ہے۔ میری بیوی اس کا مطلب نہ سمجھی، مگر ہنس پڑی۔ نوکر کسی قدر بوکھلا گیا: ''نہیں صاحب .... میں .... تلاش کر رہا تھا کہ گلاس کہاں ہیں۔''

میری بیوی نے اس کو پانی لانے سے منع کر دیا۔ اس نے وہ ٹوٹا ہوا مگ واپس الماری کے نیچے اس انداز سے رکھا جیسے وہی اس کی جگہ تھی، اگر اسے کہیں اور رکھ دیا جاتا تو یقیناً گھر کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ یوں کمرے سے باہر نکلا جیسے اس کو معلوم تھا کہ ہمارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

میں پلنگ پر بیٹھا تھا جو غالباً چڈے کا تھا۔ اس سے کچھ دور ہٹ کر دو آرام کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک پر میری بیوی بیٹھی پہلو بدل رہی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ اتنے

میں چڈہ آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں تھا کہ ہم اس کے مہمان ہیں اور اس لحاظ سے ہماری خاطر داری اس پر لازم تھی۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے کہا: "ویٹ از ویٹ ——— تو تم آ گئے اولڈ بوائے ——— چلو ذرا اسٹوڈیو تک ہو آئیں۔ تم ساتھ ہو گے تو ایڈوانس ملنے میں آسانی ہو جائے گی............ آج شام کو............" میری بیوی پر اس کی نظر پڑی تو وہ رک گیا اور کھل کھلا کر ہنسنے لگا: "بھابی جان کہیں آپ نے اسے مولوی تو نہیں بنا دیا"؟ پھر اور زور سے ہنسا "مولویوں کی ایسی تیسی! اٹھو منٹو، بھابی جان یہاں بیٹھتی ہیں، ہم ابھی آ جائیں گے!"

میری بیوی جل کر پہلے کوئلہ تھی تو اب بالکل راکھ ہو گئی تھی۔ میں اٹھا اور چڈہ کے ساتھ ہولیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر پیچ و تاب کھا کر وہ سو جائے گی: چنانچہ یہی ہوا۔ اسٹوڈیو پاس ہی تھا۔ افرا تفری میں مہتہ جی کے سر چڑھ کے چڈے نے مبلغ دو سو روپے وصول کئے اور ہم پون گھنٹہ میں جب واپس آئے تو دیکھا کہ وہ آرام کرسی پر بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ہم نے اسے بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور دوسرے کمرے میں چلے گئے جو کباڑ خانے سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں جو چیز تھی، حیرت انگیز طریقے پر ٹوٹی ہوئی تھی کہ سب مل کر ایک سا لگی اختیار کر گئی ہر شئے گرد آلود تھی، اور اس آلودگی میں ایک ضروری پن تھا، جیسے اس کی موجودگی اس کمرے کی بوہیمی فضا کی تکمیل کے لئے لازمی تھی۔ چڈے نے فوراً ہی اپنے نوکر کو ڈھونڈ نکالا اور اسے سو روپے کا نوٹ دے کر کہا: "چین کے شہزادے............ دو بوتلیں تھرڈ کلاس رم کی لے آؤ ——— میرا مطلب ہے تھری ایکس رم کی، اور نصف درجن گلاس"۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نوکر صرف چین ہی کا نہیں، دنیا کے ہر بڑے ملک کا شہزادہ تھا۔ چڈے کی زبان پر جس ملک کا نام آ جاتا، وہ اسی کا شہزادہ بن جاتا تھا ——— اس وقت چین کا شہزادہ سو کا نوٹ انگلیوں سے کھڑ کھڑاتا چلا گیا۔

چڈے نے ٹوٹے ہوئے اسپرنگوں والے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہونٹ تھری ایکس کے استقبال میں چٹخارتے ہوئے کہا: "ویٹ از ویٹ ——— تو آفٹر آل تم ادھر آ ہی نکلے ———" لیکن ایک دم متفکر ہو گیا۔ "یار، بھابی کا کیا ہو............ وہ تو گھبرا جائے گی۔"

چڈہ بغیر بیوی کے تھا، مگر اس کو دوسروں کی بیویوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ان کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ ساری عمر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "یہ احساس کمتری ہے جس نے مجھے ابھی تک اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔ جب شادی کا سوال آتا ہے تو فوراً تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن بعد

میں یہ سوچ کر کہ میں بیوی کے قابل نہیں ہوں ساری تیاری کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیتا ہوں۔"

رم فوراً ہی آ گئی، اور گلاس بھی۔ چڈّے نے چھ منگوائے تھے۔ اور چین کا شہزادہ تین لایا تھا۔ بقایا تین راستے میں ٹوٹ گئے تھے چڈّے نے ان کی کوئی پروانہ کی۔ اور خدا کا شکر کیا کہ بوتلیں سلامت رہیں۔ ایک بوتل جلدی جلدی کھول کر اس نے کنوارے گلاسوں میں رم ڈالی اور کہا: "تمہارے پونہ آنے کی خوشی میں۔"

ہم دونوں نے لمبے لمبے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیئے۔

دوسرا دور شروع کر کے چڈّہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں دیکھ کر آیا کہ میری بیوی ابھی تک سو رہی ہے۔ اس کو بہت ترس آیا اور کہنے لگا: "میں شور کرتا ہوں، ان کی نیند کھل جائے گی ——— پھر ایسا کریں گے.......... ٹھہرو ——— پہلے میں چائے منگواتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے رم کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور نوکر کو آواز دی: "جمیکا کے شہزادے!"

جمیکا کا شہزادہ فوراً ہی آ گیا۔ چڈّے نے اس سے کہا: "دیکھو، ممی سے کہو ایک دم فسٹ کلاس چائے تیار کر کے بھیج دے ——— ایک دم!"

نوکر چلا گیا۔ چڈّے نے اپنا گلاس خالی کیا اور شریفانہ پیگ ڈال کر کہا: "میں فی الحال زیادہ نہیں پیوں گا۔ پہلے چار پیگ مجھے بہت جذباتی بنا دیتے ہیں۔ مجھے بھابی کو چھوڑنے تمہارے ساتھ پربھات نگر جانا ہے۔"

آدھے گھنٹے کے بعد چائے آ گئی۔ بہت صاف برتن تھے اور بڑے سلیقے سے ٹرے میں چنے ہوئے تھے۔ چڈّے نے ٹی کوزی اٹھا کر چائے کی خوشبو سونگھی اور مسرّت کا اظہار کیا: "ممی از اے جیول.........." پھر اس نے ایتھوپیا کے شہزادے پر برسنا شروع کر دیا۔ اتنا شور مچایا کہ میرے کان بلبلا اٹھے۔ اس کے بعد اس نے ٹرے اٹھائی اور مجھ سے کہا۔ "آؤ!"

میری بیوی جاگ رہی تھی۔ چڈّے نے ٹرے بڑی صفائی سے شکستہ تپائی پر رکھی اور مودبانہ کہا: "حاضر ہے بیگم صاحب!"

میری بیوی کو یہ مذاق پسند نہ آیا لیکن چائے کا سامان چونکہ صاف ستھرا تھا، اس لئے اس نے انکار نہ کیا اور دو پیالیاں پی لیں۔ ان سے اس کو کچھ فرحت پہنچی۔ اور اس نے ہم دونوں سے مخاطب ہو کر معنی خیز لہجے میں کہا: "آپ اپنی چائے تو پہلے ہی پی چکے ہیں!"

میں نے جواب نہ دیا مگر چڈّے نے جھک کر بڑے ایماندار طور پر کہا: ——— "جی ہاں، یہ غلطی ہم سے سرزد ہو چکی ہے، لیکن ہمیں یقین تھا کہ آپ ضرور معاف کر دیں گی۔"

میری بیوی مسکرائی تو وہ کھِل کھلا کے ہنسا: "ہم دونوں بہت اونچی نسل کے سؤر ہیں جن پر ہر حرام شئے حلال ہے ——— چلئے اب ہم آپ کو مسجد تک چھوڑ آئیں!"......

میری بیوی کو پھر چڈے کا یہ مذاق پسند نہ آیا۔ دراصل اس کو چڈے سے نفرت تھی، بلکہ یوں کہئے کہ میرے ہر دوست سے نفرت تھی۔ اور چڈہ بالخصوص اسے بہت کھلتا تھا، اس لئے کہ وہ بعض اوقات بے تکلفی کی حدود بھی پھاند جاتا تھا۔ مگر چڈے کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی میرا خیال ہے اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ ایسی فضول باتوں میں دماغ خرچ کرنا ایک ایسی ان ڈور گیم سمجھتا تھا جو لوڈو سے کئی گنا لایعنی ہے۔ اس نے میری بیوی کے جلے بھنے تیوروں کو بڑی ہشاش بشاش آنکھوں سے دیکھا اور نوکر کو آواز دی۔ "کبابستان کے شہزادے ——— ایک عدد تانگہ لاؤ۔ رولز رائس قسم کا۔"

کبابستان کا شہزادہ چلا گیا اور ساتھ ہی چڈہ۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا تھا تخلیہ ملا تو میں نے اپنی بیوی کو سمجھایا کہ کباب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جایا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتے۔ ان کو بسر کرنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ان کو گزر جانے دیا جائے۔ لیکن حسب معمول اس نے میری اس کنفیوشیسانہ نصیحت کو پلّے نہ باندھا اور بڑبڑاتی رہی۔ اتنے میں کبابستان کا شہزادہ رولز رائس قسم کا تانگہ لے کر آ گیا۔ ہم پربھات نگر روانہ ہو گئے۔

بہت ہی اچھا ہوا کہ میرا فلموں کا پرانا ساتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی تھی چڈے نے میری بیوی اس کے سپرد کی اور کہا: "خربوزہ، خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ بیوی، بیوی کو دیکھ کر رنگ پکڑتی ہے، یہ ہم ابھی حاضر ہو کے دیکھیں گے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "چلو منٹو، اسٹوڈیو میں تمہارے دوست کو پکڑیں۔"

چڈہ کچھ ایسی افراتفری مچا دیا کرتا تھا کہ مخالف قوتوں کو سمجھنے سوچنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور باہر لے گیا اور میری بیوی سوچتی ہی رہ گئی۔ تانگے میں سوار ہو کر چڈے نے اب کچھ سوچنے کے انداز میں کہا: "یہ تو ہو گیا ——— اب کیا پروگرام ہے۔" پھر کھل کھلا کر ہنسا: "ممی ——— گریٹ ممی!"

میں اس سے پوچھنے ہی والا تھا یہ ممی کس توتخ آمون کی اولاد ہے کہ چڈے نے باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ میرا استفسار غیر طبعی موت مر گیا۔

تانگہ واپس اس ڈاک بنگلہ نما کوٹھی پر پہنچا جس کا نام سعیدہ کاٹیج تھا، اس لئے کہ اس میں

رہنے والے سب کے سب کبیدہ خاطر رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط تھا جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

اس کامیج میں کافی آدمی رہتے تھے۔ حالانکہ بادی النظر میں یہ جگہ بالکل غیر آباد معلوم ہوتی تھی۔ سب کے سب اسی فلم کمپنی میں ملازم تھے جو مہینے کی تنخواہ ہر سہ ماہی کے بعد دیتی تھی، اور وہ بھی کئی قسطوں میں۔ ایک ایک کر کے جب اس کے ساکنوں سے میرا تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ سب اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ کوئی چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر، کوئی اس کا نائب در نائب۔ ہر دوسرا کسی پہلے کا اسسٹنٹ تھا۔ اور اپنی ذاتی فلم کمپنی کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کر رہا تھا۔ پوشش اور وضع قطع کے اعتبار ہر ایک ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ کنٹرول کا زمانہ تھا مگر کسی کے پاس راشن کارڈ نہیں تھا۔ وہ چیزیں جو تھوڑی سی تکلیف کے بعد آسانی سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی تھیں، یہ لوگ بلیک مارکیٹ سے خریدتے تھے۔ پکچرز ضرور دیکھتے تھے۔ ریس کا موسم ہو تو ریس کھیلتے تھے ورنہ سٹہ۔ جیتتے شاذ و نادر تھے، مگر ہارتے ہر روز تھے۔

سعیدہ کامیج کی آبادی بہت گنجان تھی۔ چونکہ جگہ کم تھی اس لئے موٹر گراج بھی رہائش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس میں ایک فیملی رہتی تھی شیریں نام کی ایک عورت تھی جس کا خاوند شاید، محض یکسانیت توڑنے کے لئے اسسٹنٹ ڈائریکٹر نہیں تھا۔ وہ اسی فلم کمپنی میں ملازم تھا مگر موٹر ڈرائیور تھا۔ معلوم نہیں وہ کب آتا تھا اور کب جاتا تھا کیونکہ میں نے اس شریف آدمی کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ شیریں کے بطن سے ایک چھوٹا سا لڑکا تھا جس کو سعیدہ کامیج کے تمام ساکن فرصت کے اوقات میں پیار کرتے۔ شیریں جو قبول صورت تھی، اپنا بیشتر وقت گراج کے اندر گزارتی تھی۔

کامیج کا معزز حصہ چڈے اور اس کے دو ساتھیوں کے پاس تھا یہ دونوں بھی ایکٹر تھے مگر ہیرو نہیں تھے ایک سعید تھا جس کا فلمی نام رنجیت کمار تھا ــــــ چڈہ کہا کرتا تھا: ''سعیدہ کامیج اسی خرذات کے نام کی رعایت سے مشہور ہے ورنہ اس کا نام کبیدہ کامیج ہی تھا۔'' خوش شکل تھا اور بہت کم گو۔ چڈہ کبھی کبھی اسے کچھوا کہا کرتا تھا، اس لئے کہ وہ ہر کام بہت آہستہ آہستہ کرتا تھا۔

دوسرے ایکٹر کا نام معلوم نہیں کیا تھا مگر سب اسے غریب نواز کہتے تھے۔ حیدر آباد کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ایکٹنگ کے شوق میں یہاں چلا آیا تھا۔ تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہوار مقرر تھی۔ ایک برس ہو گیا تھا ملازم ہوئے مگر اس دوران میں اس نے صرف ایک دفعہ ڈھائی سو روپے بطور ایڈوانس لئے تھے، وہ بھی چڈے کے لئے کہ اس پر ایک بڑے خونخوار پٹھان کے قرض کی ادائگی لازم ہو گئی تھی۔ ادب لطیف قسم کی عبارت میں فلمی کہانیاں لکھنا اس کا شغل تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی موزوں کر لیتا تھا۔ کامیج کا ہر شخص اس کا مقروض تھا۔

شکیل اور عقیل دو بھائی تھے۔ دونوں کسی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے اور برعکس نام نہند نام زنگی با کافور کی ضرب المثل کے ابطال کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔

بڑے تین، یعنی چڈہ، سعید اور غریب نواز شیریں کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تینوں اکٹھے گراج میں نہیں جاتے تھے۔ مزاج پرسی کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ تینوں جب کاٹیج کے بڑے کمرے میں جمع ہوتے تو ان میں سے ایک اٹھ کر گراج میں چلا جاتا اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر شیریں سے گھریلو معاملات پر بات چیت کرتا رہتا۔ باقی دو اپنے اشغال میں مصروف رہتے۔

جو اسسٹنٹ قسم کے لوگ تھے وہ شیریں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے کبھی بازار سے اس کو سودا سلف لا دیا، کبھی لانڈری میں اس کے کپڑے دھلنے دے آئے اور کبھی اس کے روتے بچے کو بہلا دیا۔

ان میں سے کبیدہ خاطر کوئی بھی نہ تھا سب کے سب مسرور تھے۔ شاید اپنی کبیدگی پردہ اپنے حالات کی نامساعدت کا ذکر بھی کرتے تھے تو بڑے شاداں و فرحاں انداز میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی بہت دلچسپ تھی۔

ہم کاٹیج کے گیٹ میں داخل ہونے والے تھے کہ غریب نواز صاحب باہر آرہے تھے۔ چڈے نے ان کی طرف غور سے دیکھا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ بغیر گنے اس نے کچھ غریب نواز کو دیئے اور کہا: ”چار بوتلیں اسکاچ کی چاہئیں۔ کمی آپ پوری کر دیجئے گا۔ بیشی ہو تو وہ مجھے واپس مل جائے۔“

غریب نواز کے حیدرآبادی ہونٹوں پر گہری سانولی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ چڈہ کھلکھلا کر ہنسا اور میری طرف دیکھ کر اس نے غریب نواز سے کہا:

یہ مسٹر ونٹو ہیں.......... لیکن ان سے مفصل ملاقات کی اجازت اس وقت نہیں مل سکتی۔ یہ رم پئے ہیں۔ شام کو اسکاچ آجائے تو.......... لیکن آپ جائیے۔“

غریب نواز چلا گیا ہم اندر داخل ہوئے۔ چڈے نے ایک زور کی جمائی لی اور رم کی بوتل اٹھائی جو نصف سے زیادہ خالی تھی۔ اس نے روشنی میں مقدار کا سرسری اندازہ کیا اور نوکر کو آواز دی: ”قزامستان کے شہزادے“ جب وہ نمودار نہ ہوا تو اس نے اپنے گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈالتے ہوئے کہا: ”زیادہ پی گیا ہے کم بخت!“

یہ گلاس ختم کر کے وہ کچھ فکر مند ہو گیا: ”یار بھابی کو تم خوامخواہ یہاں لائے — خدا کی قسم مجھے اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا ہے۔“ پھر اس نے خود ہی اپنے کو تسکین دی۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ بور نہیں ہوگی وہاں۔“

میں نے کہا: ''ہاں وہاں رہ کر وہ میرے قتل کا فوری ارادہ نہیں کر سکتی'' اور میں نے اپنے گلاس میں رم ڈالی جس کا ذائقہ پسے ہوئے گُڑ کی طرح تھا۔

جس کباڑ خانے میں ہم بیٹھے تھے، اس میں سلاخوں والی دو کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا غیر آباد حصّہ نظر آتا تھا۔ ادھر سے کسی نے باآواز بلند چڈّہ کا نام پکارا۔ میں چونک پڑا۔ دیکھا کہ میوزک ڈائریکٹر ون کترے ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس نسل کا ہے۔ منگولی ہے، حبشی ہے آریہ ہے یا کیا بلا ہے۔ کبھی کبھی اس کے کسی خدوخال کو دیکھ کر آدمی کسی نتیجے پر پہنچنے ہی والا ہوتا تھا کہ اس کے تقابل میں کوئی ایسا نقش نظر آجاتا کہ فوراً ہی نئے سرے سے غور کرنا پڑ جاتا تھا۔ ویسے وہ مرہٹہ تھا مگر شیواجی کی تیکھی ناک کے بجائے اس کے چہرے پر بڑے حیرت ناک طریقے پر مڑی ہوئی چپٹی ناک تھی جو اس کے خیال کے مطابق ان سروں کے لئے بہت ضروری تھی جن کا تعلق براہ راست ناک سے ہوتا ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو چلّایا: ''منٹو — منٹو سیٹھ!''

چڈّے نے اس سے زیادہ اونچی آواز میں کہا ''سیٹھ کی ایسی تیسی .... چل، اندر آ''۔ وہ فوراً اندر آگیا۔ اپنی جیب سے اس نے ہنستے ہوئے رم کی ایک بوتل نکالی اور تپائی پر رکھ دی۔ ''میں سالا دھرمیؔ کے پاس گیا۔ وہ بولا۔ تمہارا فرینڈ آئے لا .... میں بولا سالا یہ فرینڈ کون ہونے کو سکتا ہے .... سالا مالوم نہ تھا سالا منٹو ہے۔''

چڈّے نے ون کترے کے کدو ایسے سر پر ایک دھول جمائی۔ ''اب چپ کر سالے کے .... تو رم لے آیا .... بس ٹھیک ہے۔ ون کترے نے اپنا سر سہلایا اور میرا خالی گلاس اٹھا کر اپنے لئے پیگ تیار کیا۔ ''منٹو .... یہ سالا آج ملتے ہی کہنے لگا۔ آج پینے کو جی چاہتا ہے .... میں ایک دم کڑکا .... سوچا کیا کروں۔''

چڈّے نے ایک اور دھپّا اس کے سر پر جمایا: ''بیٹھ بے جیسے تو نے کچھ سوچا ہی ہوگا۔''

''سوچا نہیں تو سالا یہ اتنی بڑی باٹلی کہاں سے آیا — تیرے باپ نے دیا مجھ کو۔'' ون کترے نے ایک ہی جرعے میں رم ختم کر دی۔ چڈّے نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اس سے پوچھا: ''تو یہ تو بتا کہ ممی کیا بولی؟ — بولی تھی؟ — موذیل کب آئے گی؟ ارے ہاں .... وہ پلیٹینم بلونڈ!''

ون کترے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر چڈّے نے میرا بازو پکڑ کر کہنا شروع کر دیا۔ ''منٹو — خدا کی قسم کیا چیز ہے — سنا کرتے تھے کہ ایک شے پلیٹینم بلونڈ بھی ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے کا اتفاق کل ہوا — بال ہیں، جیسے چاندی کے مہین مہین تار — گریٹ — خدا کی قسم منٹو بہت

گریٹ .... ممی زندہ باد!'' پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے ون کترے کی طرف دیکھا اور کڑک کر کہا۔ ''کن کترے کے بچے ـــ نعرہ کیوں نہیں لگاتا ـــ ممی زندہ باد!''

چڈے اور ون کترے دونوں نے مل کر ''ممی زندہ باد'' کے کئی نعرے لگائے اس کے بعد ون کترے نے چڈے کے سوالوں کا پھر جواب دینا چاہا مگر اس نے اسے خاموش کر دیا۔

''چھوڑ و یار ـــ میں جذباتی ہو گیا ہوں ـــ اس وقت یہ سوچ رہا ہوں کہ عام طور پر معشوق کے بال سیاہ ہوتے ہیں۔ جنہیں کالی گھٹا سے تشبیہ دی جاتی رہی ہے ـــ مگر یہاں کچھ اور ہی سلسلہ ہو گیا ہے ـــ'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''منٹو ـــ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کے بال چاندی کے تاروں جیسے ہیں ـــ چاندی کا رنگ بھی نہیں کہا جا سکتا ـــ معلوم نہیں پلیٹینم کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ کیونکہ میں نے ابھی تک یہ دھات نہیں دیکھی ـــ کچھ عجیب ہی سا رنگ ہے ـــ فولاد اور چاندی دونوں کو ملا دیا جائے۔ ون کترے نے دوسرا پیگ ختم کیا۔'' اور اس میں تھوڑی سی تھری ایکس رم مکس کر دی۔

چڈے نے بھنا کر اس کو ایک فربہ اندام گالی دی '' ـــ بکواس نہ کر۔'' پھر اس نے بڑی رحم انگریز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''یار ـــ میں واقعی جذباتی ہو گیا ہوں ـــ ہاں ـــ وہ رنگ ـــ خدا کی قسم لاجواب رنگ ہے ـــ وہ تم نے دیکھا ہے ـــ وہ جو مچھلیوں کے پیٹ میں ہوتا ہے ـــ نہیں نہیں ہر جگہ ہوتا ہے ـــ پومفریٹ مچھلی ـــ اس کے وہ کیا ہوتے ہیں؟ ـــ نہیں نہیں ـــ سانپوں کے ـــ وہ ننھے ننھے کھپرے ـــ ہاں کھپرے ـــ بس ان کا رنگ

کھپرے ـــ یہ لفظ مجھے ایک ہندستوڑے نے بتایا تھا ـــ اتنی خوبصورت چیز اور اتنا واہیات نام .... پنجابی میں ہم انہیں چانے کہتے ہیں۔ اس لفظ میں چنچناہٹ ہے .... وہی .... بالکل وہی جو اس کے بالوں میں ہے .... لٹیں ننھی ننھی سنپولیاں معلوم ہوتی ہیں جو لوٹ لگا رہی ہوں ....'' وہ ایک دم اٹھا۔ ''سنپولیوں کی ایسی تیسی، میں جذباتی ہو گیا ہوں۔''

ون کترے نے بڑے بھولے انداز میں پوچھا: ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

چڈے نے جواب دیا: ''سنٹی منٹل .... لیکن تو کیا سمجھے گا بالا جی باجی راؤ اور نانا فرنویس کی اولاد ....''

ون کترے نے اپنے لئے ایک اور پیگ بنایا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''یہ سالا چڈہ

سمجھتا ہے میں، انگلش نہیں سمجھتا ہوں۔ میٹری کولیٹ ہوں .... سالا میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا......... اس نے.........''

چڈے نے چڑ کر کہا: ''اس نے تجھے تان سین بنا دیا......... تیری ناک مروڑ دی کہ نکوڑے سر آسانی سے تیرے اندر سے نکل سکیں .... بچپن ہی میں اس نے تجھے دھرپد گانا سکھا دیا تھا۔ اور دودھ پینے کے لئے تو میاں کی ٹوڑی میں رویا کرتا تھا۔ اور پیشاب کرتے وقت اڑانہ میں .... اور تو نے پہلی بات پٹ دیپکی میں کی تھی۔ اور تیرا باپ ...... جگت استاد تھا۔ بڑے بڑے کے بھی کان کاٹتا تھا......... اور تو آج اس کے کان کاٹتا ہے۔ اسی لئے تیرا نام کن کترے ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: ''منٹو......... یہ سالا جب بھی پیتا ہے اپنے باپ کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے......... وہ اس سے محبت کرتا تھا تو مجھ پر اس نے کیا احسان کیا۔ اور اس نے اس میٹریکولیٹ بنا دیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی بی۔ اے کی ڈگری پھاڑ کر پھینک دوں۔''

ون کترے نے اس بوچھار کی مدافعت کرنا چاہی مگر چڈے نے اس کو وہیں دبا دیا: ''چپ رہ......... میں کہہ چکا ہوں کہ سنٹی میٹل ہو گیا ہوں......... ہاں، وہ رنگ .... پومفریٹ مچھلی کے......... نہیں نہیں — سانپ کے ننھے ننھے کھپرے......... بس انہی کا رنگ .... ممی نے خدا معلوم اپنی بین پر کون سا راگ بجا کر اس ناگن کو باہر نکالا!''

ون کترے سوچنے لگا: ''پیٹی منگواؤ، میں بجاتا ہوں۔''

چڈہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا: ''بیٹھ بے میٹریکولیٹ کے چاکولیٹ ....'' اس نے رم کی بوتل میں سے رم کے باقیات اپنے گلاس میں انڈیلے اور مجھ سے کہا: ''منٹو اگر یہ پلیٹینم بلونڈ نہ پٹی تو مسٹر چڈہ ہمالیہ پہاڑ کی کسی اونچی چوٹی پر دھونی رما کر بیٹھ جائے گا.........'' اور اس نے گلاس خالی کر دیا۔

ون کترے نے اپنی لائی ہوئی بوتل کھولنی شروع کی: ''منٹو ملگی ایک دم چانگلی ہے......''

میں نہ کہا: ''دیکھ لیں گے۔''

''آج ہی......... آج رات میں ایک پارٹی دے رہا ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا ہوا کہ تم آ گئے اور شری ایک سو آٹھ مہتا جی نے تمہاری وجہ سے وہ ایڈوانس دے دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی .... آج کی رات...... آج کی رات.........'' چڈے نے بڑے بھونڈے سروں میں گانا شروع کر دیا۔

''آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ''

ون کترے بیچارہ اس کی اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کرنے ہی والا تھا کہ غریب نواز اور رنجیت کمار آگئے۔

دونوں کے پاس اسکاچ کی دو دو بوتلیں تھیں۔ یہ انہوں نے میز پر رکھیں۔ رنجیت کمار سے میرے اچھے خاصے مراسم تھے مگر بے تکلف نہیں، اس لئے ہم دونوں نے تھوڑی سی، آپ کب آئے، آج ہی آیا، ایسی رسمی گفتگو کی اور گلاس ٹکرا کر پینے میں مشغول ہو گئے۔

چڈہ واقعی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ ہر بات میں اس پلیٹنم بلونڈ کا ذکر لے آتا تھا۔ رنجیت کمار دوسری بوتل کا چوتھائی حصہ چڑھا گیا تھا۔ غریب نواز نے اسکاچ کے تین پیگ پیے تھے۔ نشے کے معاملے میں ان سب کی سطح اب ایک ایسی تھی۔ میں چونکہ زیادہ پینے کا عادی ہوں اس لئے میرے جذبات معتدل تھے۔ میں نے ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ چاروں اس نئی لڑکی پر بہت بری طرح فریفتہ تھے جو ممی نے کہیں سے پیدا کی تھی۔ اس نایاب دانے کا نام فی لس تھا۔ پونہ میں کوئی ہیئر ڈریسنگ سیلون تھا جہاں وہ ملازم تھی۔ اس کے ساتھ عام طور پر ایک ہیجڑہ نما لڑکا رہتا تھا۔ لڑکی کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب تھی۔ غریب نواز تو یہاں تک اس پر گرم تھا کہ وہ حیدر آباد میں اپنے حصے کی جائداد بیچ کر بھی اس داؤ پر لگانے کے لئے تیار تھا۔ چڈے کے پاس ترپ کا صرف ایک پتا تھا، اپنا قبول صورت ہونا، ون کترے کا بزعم خود یہ خیال تھا کہ اس کی پیش کردہ پری ضرور شیشے میں اتر آئے گی۔ اور رنجیت کمار جارحانہ اقدام ہی کو کارگر سمجھتا تھا لیکن سب آخر میں یہی سوچتے تھے کہ دیکھئے ممی کس پر مہربان ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پلیٹنم بلونڈ فی لس کو وہ عورت جسے میں نے چڈے کے ساتھ تانگے میں دیکھا تھا، کسی کے بھی حوالے کر سکتی تھی۔

فی لس کی باتیں کرتے کرتے چڈے نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی اور مجھ سے کہا: ”جہنم میں جائے یہ لونڈیا — چلو یار .... بھابی وہاں کباب ہو رہی ہوگی — لیکن مصیبت یہ ہے کہ میں کہیں وہاں بھی سنٹی مینٹل نہ ہو جاؤں .... خیر — تم مجھے سنبھال لینا۔“ اپنے گلاس کے چند آخری قطرے حلق میں ٹپکا کر اس نے نوکر کو آواز دی: ”ممیوں کے ملک مصر کے شہزادے!“

ممیوں کے ملک مصر کا شہزادہ آنکھیں ملتا نمودار ہوا جیسے کسی نے اس کو صدیوں کے بعد کھود کھاد کے باہر نکالا ہے۔ چڈے نے اس کے چہرے پر رم کے چھینٹے مارے اور کہا: ”دو عدد تانگے لاؤ .... جو مصری رتھ معلوم ہوں۔“

تانگے آگئے۔ ہم سب ان پر لد کر پربھات نگر روانہ ہوئے — میرا پرانا فلموں کا ساتھی

ہریش گھر پر موجود تھا۔ اس دور دراز جگہ پر بھی اس نے میری بیوی کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ چڈّے نے آنکھ کے اشارے سے اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا تھا۔ چنانچہ یہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ میری بیوی نے غیظ وغضب کا اظہار نہ کیا۔ اس کا وقت وہاں کچھ اچھا ہی کٹا تھا۔ ہریش نے جو عورتوں کی نفسیات کا ماہر تھا، بڑی پر لطف باتیں کیں اور آخر میں میری بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کی شوٹنگ دیکھنے چلے جو اس روز ہونے والی تھی۔ میری بیوی نے پوچھا: ''کوئی گانا فلمارہے ہیں آپ؟''

ہریش نے جواب دیا: ''جی نہیں .... وہ کل کا پروگرام ہے .... میرا خیال ہے آپ کل چلئے گا۔''

ہریش کی بیوی شوٹنگ دیکھ دیکھ کر اور دکھا دکھا کر عاجز آئی ہوئی تھی، اس نے فوراً ہی میری بیوی سے کہا: ''ہاں کل ٹھیک رہے گا — آج تو انہیں سفر کی تھکن بھی ہے۔''

ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہریش نے پھر کچھ دیر تک پر لطف باتیں کیں۔ آخر میں مجھ سے کہا: ''چلو یار — تم چلو میرے ساتھ!'' اور میرے تین ساتھیوں کی طرف دیکھا ''ان کو چھوڑو .... سیٹھ صاحب تمہاری کہانی سننا چاہتے ہیں۔''

میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور ہریش سے کہا: ''ان سے اجازت لے لو۔''

میری سادہ لوح بیوی جال میں پھنس چکی تھی۔ اس نے ہریش سے کہا: ''میں نے بمبئی سے چلتے وقت ان سے کہا بھی تھا کہ اپنا ڈوکومنٹ کیس ساتھ لے چلئے پر انہوں نے کہا کہ کوئی ضرورت نہیں — اب یہ کہانی کیا سنائیں گے۔''

ہریش نے کہا: ''زبانی سنادے گا۔'' پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں کہو جلدی۔

میں نے اطمینان سے کہا: ہاں ایسا ہو سکتا ہے''

چڈّے نے اس ڈرامے میں تکمیلی ٹچ دیا: ''تو بھئی ہم چلتے ہیں۔'' اور وہ تینوں اٹھ کر نمستے کر کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اور ہریش نکلے — پربھات نگر کے باہر تانگے کھڑے تھے۔ چڈّے نے ہمیں دیکھا تو زور کا نعرہ بلند کیا: ''راجہ ہریش چندر زندہ باد .... '

ہریش کے سوا ہم سب ممّی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اس کو اپنی ایک سہیلی سے ملنے جانا تھا۔

یہ بھی ایک کاٹیج تھی۔ شکل وصورت اور ساخت کے اعتبار سے سعیدہ کاٹیج جیسی مگر بہت صاف ستھری جس سے ممّی کے سلیقے اور قرینے کا پتا چلتا تھا۔ فرنیچر معمولی تھا مگر جو چیز جہاں تھی

بھی ہوئی تھی۔ پربھات نگر سے چلتے وقت میں نے سوچا تھا کوئی قحبہ خانہ ہوگا مگر اس گھر کی کسی چیز سے بھی بصارت کو ایسا شک نہیں ہوتا تھا۔ وہ ویسا ہی شریفانہ تھا جیسا کہ ایک اوسط درجے کے عیسائی کا ہوتا ہے، لیکن ممی کی عمر کے مقابلے میں وہ جوان جوان دکھائی دیتا تھا۔ اس پر وہ میک اپ نہیں تھا جو میں نے ممّی کے جھریوں والے چہرے پر دیکھا تھا۔ جب ممّی ڈرائنگ روم میں آئی تو میں نے سوچا کہ گرد و پیش کی جتنی چیزیں ہیں وہ آج کی نہیں، بہت برسوں کی ہیں۔ صرف ممی آگے نکل کر بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور وہ ویسی کی ویسی پڑی رہی ہیں —— ان کی عمر جو تھی وہ وہیں کی وہیں رہی ہے۔........ لیکن جب میں نے اس کے گہرے اور شوخ میک اپ کی طرف دیکھا تو میرے دل میں نہ جانے کیوں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش کے ماحول کی طرح سنجیدہ متین طور پر جوان بن جائے۔

چڈے نے اس سے میرا تعارف کرایا جو بہت مختصر تھا، اور اختصار ہی کے ساتھ اس نے ممّی کے متعلق مجھ سے یہ کہا: "یہ ممی ہیں........ دی گریٹ ممّی........"

ممّی اپنی تعریف سن کر مسکرا دی۔ اور میری طرف دیکھ کر اس نے چڈے سے انگریزی میں کہا: "تم نے چائے منگوائی تھی۔ حسب معمول نہایت افراتفری میں —— معلوم نہیں انہیں پسند بھی آئی ہوگی یا نہیں۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: مسٹر منٹو میں بہت شرمندہ ہوں........ اصل میں سارا قصور تمہارے دوست چڈے کا ہے —— جو میرا اتنا قابل اصلاح لڑکا ہے۔"

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں چائے کی تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ ممی نے مجھے فضول کی تعریف سے منع کیا اور چڈے سے کہا:

"رات کا کھانا تیار ہے........ یہ میں نے اس لئے کہا کہ تم عین وقت کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاؤ گے........"

چڈے نے ممّی کو گلے سے لگا لیا: "یو آر اے جیول ممّی........ یہ کھانا اب ہم کھائیں گے۔"

ممّی نے چونک کر پوچھا: "کیا؟........ نہیں ہرگز نہیں۔"

چڈے نے اسے بتایا "مسز منٹو کو ہم پربھات نگر چھوڑ آئے ہیں۔"

ممّی چلائی: خدا تمہیں غارت کرے —— یہ تم نے کیا کیا ——"

چڈہ کھِل کھلا کر ہنسا۔ "آج پارٹی جو دی جانے والی تھی۔"

"وہ تو میں نے مسز منٹو کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کینسل کر دی تھی۔" ممّی نے اپنا

سگریٹ سلگایا۔

چڈّے کا دل ڈوب گیا: "خدا اب تمہیں غارت کرے.........اور یہ سب پلین ہم نے صرف اس پارٹی کے لئے بنایا تھا۔" وہ کرسی پر یاس زدہ ہو کر بیٹھ گیا اور کمرے کے ہر ذرّے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: "لو سارے خواب ملیامیٹ ہو گئے.........پلیٹی نم بلونڈ.........اوندھے سانپ کے ننھے ننھے کھپروں جیسے رنگ والے بال........" ایک دم اس نے اٹھ کر ممی کو بازوؤں سے پکڑ لیا: "کینسل کی تھی۔۔۔اپنے دل میں کینسل کی تھی نا۔۔۔لو اس پر صاد بنا دیتا ہوں۔" اور اس نے ممی کے دل کے مقام پر انگلی سے بہت بڑا صاد بنا دیا اور باآواز بلند پکارا: "ہرّے!"

ممی متعلقہ لوگوں کو اطلاع پہنچا چکی تھی کہ پارٹی منسوخ ہو چکی ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ چڈّے کو دلگیر کرنا نہیں چاہتی تھی! چنانچہ اس نے بڑی شفقت سے اس کے گال تھپتھپائے اور کہا: "تم فکر نہ کرو.........میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔"

وہ انتظام کرنے باہر چلی گئی۔۔چڈّے نے خوشی کا ایک اور نعرہ بلند کیا اور ون کترے سے کہا: "جنرل ون کترے۔۔۔جاؤ ہیڈ کوارٹرز سے ساری بوتلیں لے آؤ۔"

ون کترے نے سیلوٹ کیا اور حکم کی تعمیل کے لئے چلا گیا۔ سعیدہ کا میچ بالکل پاس تھی، دس منٹ کے اندر اندر وہ بوتلیں لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ اس کے چڈّے کا نوکر تھا۔ چڈّے نے اس کو دیکھا تو اس کا استقبال کیا۔ "آؤ آؤ۔۔۔میر کوہ قاف کے شہزادے.........وہ۔۔۔وہ سانپ کے کھپروں جیسے رنگ کے بالوں والی لونڈیا آرہی ہیں۔۔۔۔۔تم بھی قسمت آزمائی کر لینا۔"

رنجیت کمار اور غریب نواز دونوں کو چڈّے کی یہ "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے" والی بات بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے کہا کہ یہ چڈّے کی بہت بے ہودگی ہے۔ اس بیہودگی کو انہوں نے بہت محسوس کیا تھا چڈّہ حسب عادت اپنی ہانکتا رہا اور وہ خاموش ایک کونے میں بیٹھے آہستہ آہستہ رم پی کر ایک دوسرے سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے رہے۔

میں ممی کے متعلق سوچتا رہا ڈرائنگ روم میں، غریب نواز، رنجیت کمار اور چڈّہ بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ان کی ماں باہر کھلونے لینے گئی ہے۔ یہ سب منتظر ہیں۔ چڈّہ مطمئن ہے کہ سب سے بڑھیا اور اچھا کھلونا اسے ملے گا، اس لئے کہ وہ اپنی ماں کا چہیتا ہے۔ باقی دو کا غم چونکہ ایک جیسا تھا، اس لئے وہ ایک دوسرے کے مونس بن گئے تھے.........شراب اس ماحول میں دودھ معلوم ہوتی تھی اور وہ پلیٹینم بلونڈ.........اس کا تصور ایک چھوٹی سی

لڑیا کے مانند دماغ میں آتا تھا — ہر فضا، ہر ماحول کی اپنی موسیقی ہوتی ہے .... اس وقت جو موسیقی میرے دل کے کانوں تک پہنچ رہی تھی، اس میں کوئی سُر اشتعال انگیز نہیں تھا۔ ہر شئے، ماں اور اس کے بچے اور ان کے باہمی رشتے کی طرح قابل فہم اور یقینی تھی۔

میں نے جب اس کو تانگے میں چڈے کے ساتھ دیکھا تھا تو میری جمالیاتی حس کو صدمہ پہنچا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق واہیات خیال پیدا ہوئے۔ لیکن یہ چیز مجھے بار بار ستا رہی تھی کہ وہ اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے جو اس کی جھرّیوں کو توہین ہے۔ اس ممتا کی تضحیک ہے جو اس کے دل میں چڈے، غریب نواز اور ون کترے کے لیے موجود ہے .... اور خدا معلوم اور کس کس کے لئے

باتوں باتوں میں چڈے سے میں نے پوچھا: ''یار یہ تو بتاؤ تمہاری ممی اتنا شوخ میک اپ کیوں کرتی ہے۔''

''اس لئے کہ دنیا ہر شوخ چیز کو پسند کرتی ہے .... تمہارے اور میرے جیسے اُلو اس دنیا میں بہت کم بستے ہیں جو مدھم سُر اور مدھم رنگ پسند کرتے ہیں، جو جوانی کو بچپن کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ اور .... اور جو بڑھاپے پر جوانی کا ملمع پسند نہیں کرتے .... ہم جو خود کو آرٹسٹ کہتے ہیں اُلو کے پٹھے ہیں .... میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں .... بیساکھی کا میلہ تھا .... تمہارے امرتسر میں .... رام باغ کے اس بازار میں جہاں ٹکھیائیاں رہتی ہیں .... جاٹ گزر رہے تھے .... ایک صحت مند جوان نے .... خالص دودھ اور مکھن پر پلے ہوئے جوان نے جس کی نئی جوتی اس کی لاٹھی پر بازی گری کر رہی تھی اوپر ایک کوٹھے کی طرف دیکھا اور نہایت واہیات رنگوں میں لپی پتی ایک سیاہ فام ٹکھیائی کی طرف دیکھا جس کی تیل میں جبڑی ہوئی ببریاں، اس کے ماتھے پر بڑے بدنما طریقے پر جمی ہوئی تھیں اور اپنے ساتھی کی پسلیوں میں ٹہوکا دے کر کہا .... اوئے لہنا سیاں .... وخ اوئے، اپرو خ .... سی تے پنڈ وچ مجھاں ای .... '' آخری لفظ وہ خدا معلوم کیا گول کر گیا، حالانکہ وہ شائستگی کا بالکل قائل نہیں تھا۔ کھل کھلا کر ہنسنے لگا اور میرے گلاس میں رم ڈال کر بولا: ''اس جاٹ کے لئے وہ چڑیل ہی اس وقت کوہ قاف کی پری تھی .... اور اس کے گاؤں کی حسین وجمیل مٹیاریں، بے ڈھول بھینسیں .... ہم سب چغد ہیں .... درمیانے درجے کے .... اس لئے کہ اس دنیا میں کوئی چیز اوّل درجے کی نہیں .... تیسرے درجے کی ہے یا درمیانے درجے کی .... لیکن .... لیکن نی لس .... خاص الخاص درجے کی چیز ہے .... وہ سانپ

کے کھپروں..........‘‘

ون کترے نے اپنا گلاس اٹھا کر چڈے کے سر پر انڈیل دیا: ’’کھپرے.......... کھپرے..........تمہارا مستک پھر گیا ہے۔‘‘

چڈے نے ماتھے پر سے رم کے ٹپکتے ہوئے قطرے زبان سے چاٹنے شروع کر دیئے اور ون کترے سے کہا: ’’لے اب سنا..........تیرا باپ سالا تجھ سے کتنی محبت کرتا تھا.......... میرا دماغ اب کافی ٹھنڈا ہو گیا ہے!‘‘

ون کترے بہت سنجیدہ ہو کر مجھ سے مخاطب ہوا: ’’بائی گاڈ..........وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا..........میں ففٹین ایئرز کا تھا کہ اس نے میری شادی بنا دی۔‘‘

چڈہ زور سے ہنسا: ’’تمہیں کارٹون بنا دیا اس سالے نے..........بھگوان اسے سورگ میں کسیریل کی پیٹی دے کہ وہاں بھی اسے بجا بجا کر تمہاری شادی کے لئے کوئی خوبصورت حور ڈھونڈتا رہے۔‘‘

ون کترے اور بھی سنجیدہ ہو گیا: ’’منٹو..........میں جھوٹ نہیں کہتا..........میری وائف ایک دم بیوٹی فل ہے..........ہماری فیملی میں..........‘‘

تمہاری فیملی کی ایسی تیسی..........فی لس کی بات کرو..........اس سے زیادہ اور کوئی خوبصورت نہیں ہو سکتا: ’’چڈے نے غریب نواز اور رنجیت کمار کی طرف دیکھا جو کونے میں بیٹھے فی لس کے حسن کے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار ایک دوسرے سے کرنے والے تھے ’’گن پاؤڈر پلوٹ کے بانیو..........سن لو تمہاری کوئی سازش کامیاب نہیں ہو گی — میدان چڈے کے ہاتھ رہے گا..........کیوں، ویلز کے شہزادے؟‘‘

ویلز کا شہزادہ رم کی خالی ہوتی ہوئی بوتل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چڈے نے قہقہہ لگایا اور اس کو آدھا گلاس بھر کے دے دیا۔

غریب نواز اور رنجیت کمار ایک دوسرے سے فی لس کے بارے میں گھل مل کر باتیں تو کرتے رہے تھے مگر اپنے دماغ میں وہ اسے حاصل کرنے کی مختلف اسکیمیں علیحدہ طور پر بنا رہے تھے۔ یہ ان کے طرزِ گفتگو سے صاف عیاں تھا۔

ڈرائنگ روم میں اب بجلی کے بلب روشن تھے کیونکہ شام گہری ہو چلی تھی۔ چڈہ مجھ سے بمبئی کی فلم انڈسٹری کے تازہ حالات سن رہا تھا کہ باہر برآمدے میں ممی کی تیز تیز آواز سنائی دی۔ چڈے نے نعرہ بلند کیا اور باہر چلا گیا۔ غریب نواز نے رنجیت کمار کی طرف اور رنجیت کمار

نے غریب نواز کی طرف معنیٰ خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر دونوں دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

ممی چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ چار پانچ اینگلو انڈین لڑکیاں تھیں۔ مختلف قد وقامت اور خطوط والوان کی۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما اور تھلیما.........اور وہ ہیجڑا نما لڑکا.........اس کو چڈہ سسی کہہ کر پکارتا تھا۔ فی لس سب سے آخر میں نمودار ہوئی اور وہ بھی چڈے کے ساتھ۔ اس کا ایک بازو اس پلیٹینیم بلونڈ کی پتلی کمر میں حمائل تھا۔ میں نے غریب نواز اور رنجیب کمار کا ردعمل نوٹ کیا۔ ان کو چڈے کی یہ نمائشی فتح مندانہ حرکت پسند نہیں آئی تھی۔

لڑکیوں کے نازل ہوتے ہی ایک شور برپا ہو گیا۔ ایک دم اتنی انگریزی برسی کہ دن کترے میٹری کولیشن امتحان میں کئی بار فیل ہوا۔ مگر اس نے کوئی پروانہ کی اور برابر بولتا رہا۔ جب اس سے کسی نے التفات نہ برتا تو وہ ایلما کی بڑی بہن تھیلما کے ساتھ ایک صوفے پر الگ بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ اس نے ہندوستانی ڈانس کے اور کتنے نئے توڑے سیکھے ہیں۔ وہ ادھر دھانی ناکت اور تاتھئی تھئی کی ون، ٹو، تھری بنا بنا کر اس کو توڑے بتا رہا تھا، ادھر چڈہ باقی لڑکیوں کی جھرمٹ میں انگریزی کے ننگے ننگے لمرک سنا رہا تھا۔ جو اس کو ہزاروں کی تعداد میں زبانی یاد تھے —— ممی سوڈے کی بوتلیں اور گزک کا سامان منگوا رہی تھی۔ رنجیت کمار سگریٹ کے کش لگا کر ٹکٹکی باندھے فی لس کی طرف دیکھ رہا تھا، اور غریب نواز ممی سے بار بار کہتا تھا کہ روپے کم ہوں تو وہ اس سے لے لے۔

اسکاچ کھلی اور پہلا دور شروع ہوا۔ فی لس کو جب شامل ہونے کے لئے کہا گیا تو اس نے اپنے پلیٹینمی بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر انکار کر دیا کہ وہ وسکی نہیں پیا کرتی۔ سب نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانی چڈے نے بددلی کا اظہار کیا تو ممی نے فی لس کے لئے ہلکا سا مشروب تیار کیا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا کر بڑے پیار سے کہا: ”بہادر لڑکی بنو اور پی جاؤ۔“

فی لس انکار نہ کر سکی۔ چڈہ خوش ہو گیا اور اس نے اسی خوشی میں بیس پچیس اور لمرک سنائے۔ سب مزے لیتے رہے —— میں نے سوچا عریانی سے تنگ آکر انسان نے ستر پوشی اختیار کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ ستر پوشی سے اکتا کر کبھی کبھی عریانی کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔ شائستگی کا ردعمل یقیناً ناشائستگی ہے۔ اس فرار کا قطعی طور پر ایک دلکشا پہلو بھی ہے۔ آدمی کو اس سے ایک مسلسل یک آہنگی کی کوفت سے چند گھڑیوں کے لئے نجات مل جاتی ہے.........

میں نے ممی کی طرف دیکھا جو بہت ہشاش بشاش، جوان لڑکیوں میں گھلی ملی، چڈے کے ننگے ننگے لمرک سن کر ہنس رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی —— اس کے چہرے پر وہی واہیات میک

اپ تھا۔ اس کے نیچے اس کی جھرّیاں صاف نظر آ رہی تھیں مگر وہ بھی مسرور تھی......... میں نے سوچا آخر لوگ کیوں فرار کو بُرا سمجھتے ہیں......... وہ فرار جو میری آنکھوں کے سامنے تھے، اس کا ظاہر گو بدنما تھا لیکن باطن اس کا بے حد خوبصورت تھا......... اس پر کوئی بناؤ سنگھار کوئی غازہ، کوئی اُبٹنا نہیں تھا۔

پولی تھی، وہ ایک کونے میں رنجیت کمار کے ساتھ کھڑی اپنے نئے فراک کے بارے میں بات چیت کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ صرف اپنی ہوشیاری سے اس نے بڑے سستے داموں پر ایسی عمدہ چیز تیار کرالی ہے۔ دو ٹکڑے تھے جو بظاہر بالکل بے کار معلوم ہوتے تھے، مگر اب وہ ایک خوبصورت پوشاک میں تبدیل ہو گئے تھے ـــ اور رنجیت کمار بڑے خلوص کے ساتھ اس کو دو نئے ڈریس بنوا دینے کا وعدہ کر رہا تھا؛ حالانکہ اسے فلم کمپنی سے اتنے روپے یک مشت ملنے کی ہرگز امید نہیں تھی۔ ڈولی تھی، وہ غریب نواز سے کچھ قرض مانگنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کو یقین دلا رہی تھی کہ دفتر سے تنخواہ ملنے پر وہ یہ قرض ضرور ادا کر دے گی۔ غریب نواز کو قطعی طور پر معلوم تھا کہ وہ یہ روپیہ حسب معمول کبھی واپس نہیں دے گی مگر وہ اس کے وعدے پر اعتبار کیے جا رہا تھا۔ تھیلما ون کترے سے تانڈیو ناچ کے بڑے مشکل توڑے سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ون کترے کو معلوم تھا کہ ساری عمر اس کے پیر کبھی ان کے بول ادا نہیں کر سکیں گے مگر وہ اس کو بتائے جا رہا تھا اور تھیلما بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ بیکار اپنا اور ون کترے کا وقت ضائع کر رہی ہے، مگر بڑے شوق اور انہماک سے سبق یاد کر رہی تھی۔ ایلما اور کٹی دونوں پیے جا رہی تھیں اور آپس میں کسی آدمی کی بات کر رہی تھیں جس نے پچھلی ریس میں ان دونوں سے خدا معلوم کب کا بدلہ لینے کی خاطر غلط ٹپ دی تھی۔ اور چڈہ، فی لس کے سانپ کے کھپرے ایسے رنگ کے بالوں کو پگھلے ہوئے سونے کی رنگ کی اسکاچ میں ملا ملا کر پی رہا تھا۔ فی لس کا ہیجڑہ نما دوست بار بار جیب سے کنگھی نکالتا تھا اور اپنے بال سنوارتا تھا۔ ممی کبھی اس سے بات کرتی تھی، کبھی اس سے، کبھی سوڈا کھلواتی تھی۔ کبھی ٹوٹے ہوئے گلاس کے ٹکڑے اٹھواتی تھی......... اس کی نگاہ سب پر تھی۔ اس بلی کی طرح جو بظاہر آنکھیں بند کیے ستاتی ہے مگر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پانچوں بچے کہاں کہاں ہیں اور کیا کیا شرارت کر رہے ہیں۔

اس دلچسپ تصویر میں کون سا رنگ، کون سا خط غلط تھا......... ممی کا وہ بھڑکیلا اور شوخ میک اپ بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تصویر کا ایک ضروری جزو ہے۔

غالب کہتا ہے۔

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قیدِ حیات اور بندِ غم جب اصلاً ایک ہیں تو یہ کیا فرض ہے کہ آدمی موت سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے — اس نجات کے لئے کون ملک الموت کا انتظار کرے...... کیوں آدمی چند لمحات کے لئے خود فریبی کے دلچسپ کھیل میں حصّہ نہ لے۔

ممی سب کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اس کے پہلو میں ایسا دل تھا جس میں ان سب کے لئے ممتا تھی — میں نے سوچا، شاید اس لئے اس نے اپنے چہرے پر رنگ مل لیا ہے کہ لوگوں کو اس کی اصلیت معلوم نہ ہو...... اس میں شاید اتنی جسمانی قوت نہیں تھی کہ وہ ہر ایک کی ماں بن سکتی...... اس نے شفقت اور محبت کے لئے چند آدمی چن لئے تھے اور باقی ساری دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔

ممی کو معلوم نہیں تھا۔ چڈہ ایک تگڑا پیگ فی لس کو پلا چکا تھا۔ چوری چھپے، نہیں سب کے سامنے۔ مگر ممی اس وقت اندر باورچی خانے میں پوٹیٹو چپس تل رہی تھی۔ فی لس نشے میں تھی۔ ہلکے ہلکے سرور میں۔ جس طرح اس کے پالش کئے ہوئے فولاد کے رنگ کے بال آہستہ آہستہ لہراتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی لہراتی تھی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ون کترے تھیلما کو توڑے سکھا سکھا کر اب اسے بتا رہا تھا کہ اس کا باپ سالا اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ چائلڈ ہڈ ہی میں اس نے اس کی شادی بنا دی تھی۔ اس کی وائف بہت بیوٹی فل ہے...... اور غریب نواز، ڈولی کو قرض دے کر بھول بھی چکا تھا۔ رنجیت کمار پولی کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا تھا۔ ایلما اور کٹی دونوں جہان بھر کی باتیں کر کے اب تھک گئی تھیں اور آرام کرنا چاہتی تھیں — تپائی کے ارد گرد فی لس اور اس کا ہیجڑا نما ساتھی اور ممی بیٹھے تھے چڈہ اب جذباتی نہیں تھا۔ فی لس اس کے پہلو میں بیٹھی تھی جس نے پہلی دفعہ شراب کا سرور چکھا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کا عزم اس کی آنکھوں میں صاف موجود تھا۔ ممی اس سے غافل نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد فی لس کا ہیجڑہ نما دوست اٹھ کر صوفے پر دراز ہو گیا اور اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے سو گیا — غریب نواز اور ڈولی اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ ایلما اور کٹی نے آپس میں کسی مارگریٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ممی سے رخصت لی اور چلی گئیں۔...... ون کترے نے آخری بار اپنی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف کی اور فی لس کی طرف حسرت بھری نظروں

سے دیکھا پھر تھیلما کی طرف جو اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اور اس کو بازو سے پکڑ کر چاند دکھانے کے لئے باہر میدان میں لے گیا۔

ایک دم جانے کیا ہوا کہ چڈے اور ممی میں گرم گرم باتیں شروع ہو گئیں۔ چڈے کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ ایک ناخلف بچے کی طرح ممی سے بدزبانی کرنے لگا۔ فی لس نے دونوں میں مصلحت کی مہین مہین کوشش کی مگر چڈہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ فی لس کو اپنے ساتھ سعیدہ کاٹیج میں لے جانا چاہتا تھا۔ ممی اس کے خلاف تھی۔ وہ اس کو بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ اس ارادے سے باز آجائے مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بار بار ممی سے کہہ رہا تھا: "تم دیوانی ہو گئی ہو.......... بوڑھی دلالہ.......... فی لس میری ہے— پوچھ لو اس سے:"

ممی نے بہت دیر تک اس کی گالیاں سنیں، آخر میں بڑے سمجھانے والے انداز میں اس سے کہا: "چڈہ مائی سن.......... تم کیوں نہیں سمجھتے.......... شی از ینگ— شی از ویری ینگ!

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ایک التجا تھی۔ ایک سرزنش تھی، ایک بڑی بھیانک تصویر تھی، مگر چڈہ بالکل نہ سمجھا۔ اس وقت اس کے پیش نظر صرف فی لس اور اس کا حصول تھا۔ میں نے فی لس کی طرف دیکھا۔ اور میں نے پہلی دفعہ بڑی شدت سے محسوس کیا کہ وہ بہت چھوٹی عمر کی تھی۔ بمشکل پندرہ برس کی.......... اس کا سفید چہرہ، نقرئی بادلوں میں گھرا ہوا بارش کے قطرے کی طرح لرز رہا تھا۔

چڈے نے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فلموں کے ہیرو کے انداز میں اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا— ممی نے احتجاج کی چیخ بلند کی: "چڈہ...... چھوڑ دو.......... فور گارڈز سیک.......... چھوڑ دو اسے۔"

جب چڈے نے فی لس کو اپنے چوڑے سینے سے جدا نہ کیا تو ممی نے اس کے منہ پر ایک چانٹا مارا: "گٹ آؤٹ.......... گٹ آؤٹ!"

چڈہ بھونچکا رہ گیا۔ فی لس کو جدا کر کے اس نے دھکا دیا اور ممی کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا باہر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر رخصت لی اور چڈے کے پیچھے چلا گیا۔

سعیدہ کاٹیج پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ پتلون، قمیض اور بوٹ سمیت پلنگ پر اوندھے منہ لیٹا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہ کی اور دوسرے کمرے میں جا کر بڑے میز پر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ گھڑی میں دس بج رہے تھے۔ چڈہ صبح ہی صبح اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ کہاں، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں جب غسل خانے سے باہر نکل رہا تھا تو میں نے اس کی آواز سنی

جو گیراج سے باہر آ رہی تھی۔ میں رک گیا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا: ''وہ لاجواب عورت ہے —— خدا کی قسم وہ لاجواب عورت .... دعا کرو کہ اس کی عمر کو پہنچ کر تم بھی ویسی ہی گریٹ ہو جاؤ۔''

اس کے لہجے میں ایک عجیب و غریب تلخی تھی —— معلوم نہیں اس کا رخ اس کی اپنی ذات کی جانب تھا یا اس شخص کی طرف، جس سے وہ مخاطب تھا —— میں نے زیادہ دیر وہاں رکے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلا گیا۔ نصف گھنٹے کے قریب میں نے انتظار کیا۔ جب وہ نہ آیا تو میں پربھات نگر روانہ ہو گیا۔

میری بیوی کا مزاج معتدل تھا —— ہریش گھر میں نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے متعلق استفسار کیا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ پونہ میں کافی تفریح ہو گئی تھی، اس لئے میں نے ہریش کی بیوی سے کہا کہ ہمیں اجازت دی جائے۔ رسماً اس نے ہمیں روکنا چاہا، مگر سعیدہ کاٹیج ہی سے فیصلہ کر کے چلا تھا کہ رات کا واقعہ میرے لئے ذہنی جگالی کے واسطے بہت کافی ہے ——

ہم چل دیئے .... راستے میں ممی کی باتیں ہوئیں۔ جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کو من و عن سنا دیا۔ اس کا ردعمل یہ تھا کہ فی لس اس کی کوئی رشتہ دار ہو گی۔ یا وہ اسے کسی اچھی اسامی کو پیش کرنا چاہتی تھی، جب ہی اس نے چڈے سے لڑائی کی .... میں خاموش رہا۔ اس کی تردید کی نہ تائید۔

کئی دن گزرنے پر چڈے کا خط آیا جس میں اس رات کے واقعے کا سرسری ذکر تھا اور اس نے اپنے متعلق یہ کہا تھا: ''میں اس روز حیوان بن گیا تھا —— لعنت ہو مجھ پر!''

تین مہینے کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے پونہ جانا پڑا۔ سیدھا سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ چڈہ موجود نہیں تھا۔ غریب نواز سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ گیراج سے باہر نکل کر شیریں کے خوردسال بچے کو پیار کر رہا تھا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد رنجیت کمار آ گیا کچھوے کی چال چلتا، اور خاموش بیٹھ گیا۔ میں اگر اس سے کچھ پوچھتا تو وہ بڑے اختصار سے جواب دیتا۔ اس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ چڈہ اس رات کے بعد ممی کے پاس نہیں گیا اور نہ وہ کبھی یہاں آئی ہے۔ فی لس کو اس نے دوسرے روز ہی اپنے ماں باپ کے پاس بھجوا دیا تھا۔ وہ اس ہیجڑہ نما لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ کر آئی ہوئی تھی .... رنجیت کمار کو یقین تھا کہ اگر وہ کچھ دن اور پونہ میں رہتی تو وہ ضرور اسے لے اُڑتا۔ غریب نواز کو ایسا کوئی زعم نہیں تھا، اسے صرف یہ افسوس تھا کہ وہ چلی گئی۔

چڈے کے متعلق یہ پتہ چلا کہ دو تین روز سے اس کی طبیعت ناساز ہے.......... بخار رہتا ہے، مگر وہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں لیتا ــــــ سارا دن ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ غریب نواز نے جب مجھے یہ باتیں بتانا شروع کیں تو رنجیت کمار اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا اس کا رخ گیراج کی طرف تھا۔

میں غریب نواز سے گیراج والی شیریں کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے خود کو تیار ہی کر رہا تھا کہ ون کترے سخت گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چڈے کو سخت بخار تھا۔ وہ اسے تانگے میں یہاں لا رہا تھا کہ راستے میں بے ہوش ہو گیا.......... میں اور غریب نواز باہر دوڑے۔ تانگے والے نے بیہوش چڈے کو سنبھالا ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا، واقعی بہت تیز بخار تھا۔ ایک سو چھ ڈگری سے قطعاً کم نہ ہو گا۔

میں نے غریب نواز سے کہا کہ فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہئے۔ اس نے ون کترے سے مشورہ کیا۔ وہ ''ابھی آتا ہوں'' کہہ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ممی تھی جو ہانپ رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چڈے کی طرف دیکھا اور قریب قریب چیخ کر پوچھا: ''کیا ہوا میرے بیٹے کو؟''

ون کترے نے جب اسے بتایا کہ چڈہ کئی دن سے بیمار تھا تو ممی نے بڑے رنج اور غصے کے ساتھ کہا: ''تم کیسے لوگ ہو ــــــ مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔'' پھر اس نے غریب نواز، مجھے اور ون کترے کو مختلف ہدایات دیں۔ ایک کو چڈے کی پاؤں سہلانے کی، دوسرے کو برف لانے کی اور تیسرے کو پنکھا کرنے کی۔ چڈے کی حالت دیکھ کر اس کی اپنی حالت بہت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔

معلوم نہیں رنجیت کمار کو گیراج میں کیسے پتہ چلا۔ ممی کے جانے کے بعد فوراً وہ گھبرایا ہوا آیا۔ جب اس نے استفسار کیا تو ون کترے نے اس کے بیہوش ہونے کا واقعہ بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ممی ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔ یہ سن کر رنجیت کمار کا اضطراب کسی حد تک دور ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بہت مطمئن تھے جیسے چڈے کی صحت کی ساری ذمہ داری ممی نے اپنے سر لے لی ہے۔

اس کی ہدایات کے مطابق چڈے کے پاؤں سہلائے جا رہے تھے۔ سر پر برف کی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں۔ جب ممی ڈاکٹر لے کر آئی تو وہ کسی قدر ہوش میں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے

معائنے میں کافی دیر لگائی۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ چڈّے کی زندگی خطرے میں ہے۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر نے ممّی کو اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر چلے گئے ——— میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں سے دیکھا گیراج کے ٹاٹ کا پردہ ہل رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ممّی آئی۔ غریب نواز، ون کترے اور رنجیت کمار سے اس نے فرداً فرداً کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ چڈّہ اب آنکھیں کھول کر سن رہا تھا۔ ممّی کو اس نے حیرت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ الجھن سی محسوس کر رہا تھا۔

چند لمحات کے بعد جب وہ سمجھ گیا کہ ممّی کیوں اور کیسے آئی ہے تو اس نے ممّی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبا کر کہا: ''ممّی یو آر گریٹ!''

ممی اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ شفقت کا مجسمہ تھی۔ چڈّے کے تپتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس نے مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا: ''میرے بیٹے .... میرے غریب بیٹے!''

چڈّے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن فوراً ہی اس نے ان کو جذب کرنے کی کوشش کی اور کہا: ''نہیں ——— تمہارا بیٹا اوّل درجے کا اسکاؤنڈرل ہے .... جاؤ اپنے مرحوم شوہر کا پستول لاؤ اور اس کے سینے پر داغ دو!''

ممّی نے چڈّے کے گال پر ہولے سے طمانچہ مارا: ''فضول بکواس نہ کرو!'' پھر وہ چست و چالاک نرس کی طرح اُٹھی اور ہم سب سے مخاطب ہو کر کہا: ''لڑکو ——— چڈّہ بیمار ہے اور مجھے ہسپتال لے جانا ہے اسے ——— سمجھے؟''

سب سمجھ گئے۔ غریب نواز نے فوراً ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ چڈّے کو اٹھا کر اس میں ڈالا گیا۔ وہ بہت کہتا رہا کہ اتنی کونسی آفت آ گئی ہے جو اس کو ہسپتال کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ مگر ممّی یہی کہتی رہی کہ بات کچھ بھی نہیں۔ ہسپتال میں ذرا آرام رہتا ہے۔ چڈّہ بہت ضدّی تھا، مگر نفسیاتی طور پر وہ اس وقت ممّی کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

چڈّہ ہسپتال میں داخل ہو گیا ——— ممّی نے اکیلے میں مجھے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے۔ یعنی پلیگ۔ یہ سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ خود ممّی بہت پریشان تھی۔ لیکن اس کو امید تھی کہ یہ بلا ٹل جائے گی اور چڈّہ بہت جلد تندرست ہو جائے گا۔

علاج ہوتا رہا۔ پرائیوٹ ہسپتال تھا۔ ڈاکٹروں نے چڈّے کا علاج بہت توجہ سے کیا مگر کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی، اور بخار بڑھتا گیا۔ ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ اسے بمبئی لے جاؤ، مگر ممّی نہ مانی۔ اس نے چڈّے کو اسی حالت میں اٹھوایا اور

اپنے گھر لے گئی۔

میں زیادہ دیر پونہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ واپس بمبئی آیا تو میں نے ٹیلی فون کے ذریعے کئی مرتبہ اس کا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پلیگ کے حملے سے جانبر نہ ہو سکے گا۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔ ایک مقدمے کے سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں سے پندرہ دن بعد لوٹا تو میری بیوی نے چڈے کا ایک خط دیا جس میں صرف یہ لکھا تھا ''عظیم المرتبت ممی نے اپنے ناخلف بیٹے کو موت کے منہ سے بچالیا ہے۔''

ان چند لفظوں میں بہت کچھ تھا۔ جذبات کا ایک پورا سمندر تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر خلاف معمول بڑے جذباتی انداز میں کیا تو اس نے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا: ''ایسی عورتیں عموماً خدمت گزار ہوا کرتی ہیں۔''

میں نے چڈے کو دو تین خط لکھے جن کا جواب نہ آیا بعد میں معلوم ہوا کہ ممی نے اس کو تبدیلی آب و ہوا کی خاطر اپنی ایک سہیلی کے ہاں لوناولہ بھجوا دیا تھا۔ چڈہ وہاں بمشکل ایک مہینہ رہا اور اکتا کر چلا آیا۔ جس روز وہ پونہ پہنچا، اتفاق سے میں وہیں تھا۔

پلیگ کے زبردست حملے کے باعث وہ بہت کمزور ہو گیا تھا مگر اس کی غوغا پسند طبیعت اسی طرح زوروں پر تھی۔ اپنی بیماری کا اس نے اس انداز میں ذکر کیا جس طرح آدمی سائیکل کے معمولی حادثے کا ذکر کرتا ہے۔ اب کہ وہ جانبر ہو گیا تھا اپنی خطرناک علالت کے متعلق تفصیلی گفتگو اسے بیکار معلوم ہوتی تھی۔

سعیدہ کاٹیج میں چڈے کی غیر حاضری کے دوران میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ایل برادران یعنی عقیل اور شکیل کہیں اور اٹھ گئے تھے کیونکہ انہیں اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کے لئے سعیدہ کاٹیج کی فضا مناسب و موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ان کی جگہ ایک بنگالی میوزک ڈائریکٹر آ گیا تھا۔ اس کا نام سین تھا۔ اس کے ساتھ لاہور سے بھاگا ہوا ایک لڑکا رام سنگھ رہتا تھا۔ سعیدہ کاٹیج والے سب اس سے کام لیتے تھے۔ طبیعت کا بہت شریف اور خدمت گزار تھا۔ چڈے کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ ممی کے کہنے پر لوناولہ جا رہا تھا۔ اس نے غریب نواز اور رنجیت کمار سے کہہ دیا تھا کہ اسے سعیدہ کاٹیج میں رکھ لیا جائے۔ سین کے کمرے میں چونکہ جگہ خالی تھی اس لئے اس نے وہیں اپنا ڈیرا جما دیا تھا۔

رنجیت کمار کو کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو منتخب کر لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر فلم کامیاب ہوا تو اس کو دوسرا فلم ڈائریکٹ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چڈہ اپنی دو برس کی

جمع شدہ تنخواہ میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ یک مشت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے رنجیت کمار سے کہا تھا "میری جان اگر کچھ وصول کرنا ہے تو پلیگ میں مبتلا ہو جاؤ —— ہیرو اور ڈائریکٹر بننے سے میرا تو خیال ہے، بہتر ہے۔"

غریب نواز تازہ تازہ حیدر آباد سے واپس آیا تھا، اس لئے سعیدہ کاٹیج کسی قدر مرفہ الحال تھی۔ میں نے دیکھا کہ گراج کے باہر الگنی سے ایسی قمیضیں اور شلواریں لٹک رہی تھی جن کا کپڑا اچھا اور قیمتی تھا۔ شیریں کے خورد سال بچّے کے پاس نئے کھلونے تھے۔

مجھے پونہ میں پندرہ روز رہنا پڑا۔ میرا پرانا فلموں کا ساتھی اب نئے فلم کی ہیروئن کی محبت میں گرفتار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مگر ڈرتا تھا۔ کیونکہ یہ ہیروئن پنجابی تھی اور اس کا خاوند بڑی بڑی موچھوں والا ہٹا کٹا مسٹنڈا تھا۔ چڈّے نے اس کو حوصلہ دیا تھا "کچھ پروانہ کر، اس سالے کی .... جس پنجابی ایکٹرس کا خاوند بڑی بڑی مونچھوں والا پہلوان ہو، وہ عشق کے میدان میں ضرور چاروں شانے چت گرا کرتا ہے —— بس اتنا کرو کہ سو روپے فی گالی کے حساب سے مجھ سے پنجابی کی دس بڑی ہیوی ویٹ قسم کی گالیاں سیکھ لو۔ یہ تمہاری خاص مشکلوں میں بہت کام آیا کریں گی۔"

ہریش ایک بوتل فی گالی کے حساب سے چھ گالیاں پنجاب کے مخصوص لب ولہجہ میں یاد کر چکا تھا۔ مگر ابھی تک اسے اپنے عشق کے راستے میں کوئی ایسی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی جو وہ ان کی تاثیر کا امتحان لے سکتا۔

ممّی کے گھر حسب معمول محفلیں جمتی تھیں۔ پولی، ڈولی، کٹی، ایلما، تھیلما وغیرہ سب آتی تھیں۔ ون کترے بدستور تھیلما کو کتھا کلی اور تانڈیو ناچ کی تاتھئی، اور دھانی تاکت کی ون ٹو تھری بنا بنا کر بتاتا تھا اور وہ اسے سیکھنے کی پر خلوص کوشش کرتی تھی۔ غریب نواز حسب توفیق قرض دے رہا تھا۔ اور رنجیت کمار جس کو اب کمپنی کے نئے فلم میں ہیرو کا چانس مل رہا تھا ان میں سے کسی ایک کو باہر کھلی ہوا میں لے جاتا تھا —— چڈّے کے ننگے ننگے لمرک سن کر اسی طرح قہقہے برپا ہوتے تھے —— ایک صرف وہ نہیں تھی .... وہ جس کے بالوں کے رنگ کے لئے صحیح تشبیہہ ڈھونڈنے میں چڈّے نے کافی وقت صرف کیا تھا۔ مگر ان محفلوں میں چڈّے کی نگاہیں اسے ڈھونڈتی نہیں تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھی جب چڈّے کی نظریں ممّی کی نظروں سے ٹکرا کر جھک جاتی تھیں تو میں محسوس کرتا تھا کہ اس کو اپنی اس رات کی دیوانگی کا افسوس ہے۔ ایسا افسوس جس کی یاد سے اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ چوتھے پیگ کے بعد کسی وقت اس قسم کا جملہ اس کی زبان

سے بے اختیار نکل جاتا "چڈہ یو آر اے ڈیمڈ بروٹ!"

یہ سن کر ممی زیر لب مسکرادیتی تھی، جیسے وہ اس مسکراہٹ کی شیرینی میں لپیٹ لپیٹ کر یہ کہہ رہی ہے "ڈونٹ ٹوک روٹ۔"

ون کترے سے بدستور اس کی چخ چلتی تھی۔ سرور میں آکر جب وہ اپنے باپ کی تعریف میں یا اپنی بیوی کی خوبصورتی کے متعلق کچھ کہنے لگتا تو وہ اس کی بات بہت بڑے گنڈاسے سے کاٹ ڈالتا۔ وہ غریب چپ ہو جاتا، اور اپنا میٹریکیولیشن سرٹیفکیٹ تہہ کر کے جیب میں ڈال لیتا۔

ممی وہی ممی تھی ــــــ پولی کی ممی ڈولی کی ممی، رنجیت کمار کی ممی ــــــ سوڈے کی بوتلوں گزک کی چیزوں اور محفل جمانے کے دوسرے سازوسامان کے انتظام میں وہ اسی پُرشفقت انہماک سے حصّہ لیتی تھی۔ اس کے چہرے کا میک اپ ویسا ہی ہوتا تھا۔ اس کے کپڑے اسی طرح کے شوخ وشنگ تھے۔ غازے اور سرخی کی تہوں سے اس کی جھریاں اسی طرح جھانکتی تھیں۔ مگر اب مجھے یہ مقدس دکھائی دیتی تھیں۔ اتنی مقدس کے پلیگ کے کیڑے ان تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ ڈر کر سمٹ کر، وہ دوڑ گئے تھے...... چڈے کے جسم سے بھی نکل بھاگے تھے کہ اس پر ان جھریوں کا سایہ تھا.......... ان مقدس جھریوں کا جو ہر وقت نہایت واہیات رنگوں میں لتھڑی رہتی تھی۔

ون کترے کی خوبصورت بیوی کے جب اسقاط ہوا تھا تو ممی ہی کی بروقت امداد سے اس کی جان بچی تھی۔ تھیلما جب ہندوستانی رقص سیکھنے کے شوق میں مارواڑ کے ایک کتھک کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اس سودے میں ایک روز جب اس کو اچانک معلوم ہوا تھا کہ اس نے ایک مرض خرید لیا ہے تو ممی نے اس کو بہت ڈانٹا تھا اور اس کو جہنم سپرد کر کے ہمیشہ کے لئے اس سے قطع تعلق کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا تھا۔ اس نے اسی روز شام کو اپنے بیٹوں کو ساری بات بنادی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ تھیلما کا علاج کرائیں۔ کئی کو ایک معما حل کرنے کے سلسلے میں پانچ سو روپے کا انعام ملا تھا تو اس نے مجبور کیا تھا کہ وہ کم از کم اس کے آدھے روپے غریب نواز کو دیدے کیونکہ اس غریب کا ہاتھ تنگ ہے۔

اس نے کئی سے کہا تھا "تم اس وقت اسے دے دو ــــــ بعد میں لیتی رہنا"۔ اور مجھ سے اس نے پندرہ روز کے قیام کے دوران میں کئی مرتبہ میری مسز کے بارے میں پوچھا تھا اور تشویش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے بچّے کی موت کو اتنی برس ہو گئے ہیں، دوسرا بچہ کیوں نہیں ہوا۔

رنجیت کمار سے زیادہ رغبت کے ساتھ بات نہیں کرتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نمائش پسند طبیعت اس کو اچھی نہیں لگتی۔ میرے سامنے اس کا اظہار وہ ایک دو مرتبہ لفظوں میں بھی

کر چکی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر سین سے وہ نفرت کرتی تھی۔ چڈہ اس کو اپنے ساتھ لاتا تھا تو وہ اس سے کہتی تھی "ایسے ذلیل آدمی کو یہاں مت لایا کرو"۔ چڈہ اس سے وجہ پوچھتا تو وہ بڑی سنجیدگی سے یہ جواب دیتی تھی کہ "مجھے یہ آدمی اوپرا اوپرا سا معلوم ہوتا ہے ——— فٹ نہیں بیٹھتا میری نظروں میں"۔ یہ سن کر چڈہ ہنس دیتا تھا۔

ممی کے گھر کی محفلوں کی پرخلوص گرمی لئے میں واپس بمبئی چلا گیا۔ ان محفلوں میں رندی تھی بلانوشی تھی، جنسیاتی رنگ تھا۔ مگر کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہر چیز حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح قابل فہم تھی۔ اسی طرح ابھری ہوئی۔ بظاہر اسی طرح کڈھب بینڈی اور دیکھنے والے کو گومگو کی حالت میں ڈالنے والی۔ مگر اصل میں بڑی صحیح باسلیقہ اور اپنی جگہ پر قائم۔

دوسرے روز صبح کے اخباروں میں یہ پڑھا کہ سعیدہ کاٹیج میں بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین مارا گیا ہے۔ اس کو قتل کرنے والا کوئی رام سنگھ ہے جس کی عمر چودہ پندرہ برس کے قریب بتائی جاتی ہے۔ میں نے فوراً پونہ ٹیلی فون کیا مگر کوئی نہ مل سکا۔

ایک ہفتہ کے بعد چڈے کا خط آیا جس میں حادثۂ قتل کی پوری تفصیل تھی۔ رات کو سب سوئے تھے کہ چڈے کے پلنگ پر اچانک کوئی گرا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ روشنی کی تو دیکھا کہ سین ہے، خون میں لت پت چڈہ اچھی طرح اپنے ہوش وحواس سنبھالنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے میں رام سنگھ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ فوراً ہی غریب نواز اور رنجیت کمار بھی آ گئے۔ ساری سعیدہ کاٹیج بیدار ہو گئی۔ رنجیت کمار اور غریب نواز نے رام سنگھ کو پکڑ لیا اور چھری اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ چڈے نے سین کو اپنے پلنگ پر لٹایا اور اس سے زخموں کے متعلق کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے آخری ہچکی لی اور ٹھنڈا ہو گیا۔

رام سنگھ، غریب نواز اور رنجیت کمار کی گرفت میں تھا، مگر وہ دونوں کانپ رہے تھے۔ سین مر گیا تو رام سنگھ نے چڈے سے پوچھا: "بھاپا جی ——— مر گیا؟"

چڈے نے اثبات میں جواب دیا تو رام سنگھ نے رنجیت کمار اور غریب نواز سے کہا: "مجھے چھوڑ دیجئے میں بھاگوں گا نہیں۔

چڈے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے فوراً نوکر بھیج کر ممی کو بلوایا۔ ممی آئی تو سب مطمئن ہو گئے کہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اس نے رام سنگھ کو آزاد کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گئی جہاں اس کا بیان درج کرا دیا گیا۔ اس کے بعد چڈہ اور اس کے ساتھی کئی دن تک سخت پریشان رہے۔ پولیس کی پوچھ گچھ، بیانات، پھر عدالت میں مقدمے کی

پیروی۔ ممی اس دوران میں بہت دوڑ دھوپ کرتی رہی تھی۔ چڈہ کو یقین تھا کہ رام سنگھ بری ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ماتحت عدالت ہی نے اسے صاف بری کر دیا۔ عدالت میں اس کا وہی بیان تھا جو اس نے تھانے میں دیا تھا۔ ممی نے اس سے کہا تھا۔ بیٹا گھبراؤ نہیں۔ جو کچھ ہوا ہے، سچ سچ بتا دو ——— اور اس نے تمام واقعات من و عن بیان کر دیئے تھے کہ سین نے اس کو پلے بیک سنگر بنا دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس کو خود بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا، اور سین بہت اچھا گانے والا تھا۔ وہ اس چکر میں آ کر اس کی شہوانی خواہشات کو پوری کرتا رہا۔ مگر اس کو اس سے سخت نفرت تھی اس کا دل بار بار اسے لعنت ملامت کرتا تھا۔ آخر میں وہ اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے سین سے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر اس نے پھر اسے مجبور کیا تو وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔ چنانچہ واردات کی رات کو یہی ہوا۔

عدالت میں اس نے یہی بیان دیا۔ ممی موجود تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ رام سنگھ کو دلاسا دیتی رہی کہ گھبراؤ نہیں، جو سچ ہے کہہ دو۔ سچ کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ہاتھوں نے خون کیا ہے مگر ایک بڑی نجس چیز کا۔ ایک خباثت کا۔ ایک غیر فطری سودے کا۔

رام سنگھ نے بڑی سادگی بڑے بھولپن اور بڑے معصومانہ انداز میں سارے واقعات بیان کئے۔ مجسٹریٹ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رام سنگھ کو بری کر دیا۔ چڈے نے کہا: ''اس جھوٹے زمانے میں یہ صداقت کی حیرت انگیز فتح ہے ——— اور اس کا سہرہ میری بڈھی ممی کے سر ہے۔''

چڈے نے مجھے اس جلسے میں بلایا تھا جو رام سنگھ کی رہائی کی خوشی میں سعیدہ کاٹیج والوں نے کیا تھا۔ مگر میں مصروفیت کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایل برادرز شکیل اور عقیل دونوں واپس سعیدہ کاٹیج آ گئے تھے۔ باہر کی فضا بھی ان کی ذاتی فلم کمپنی کی تاسیس و تعمیر کے لئے راس نہ آئی تھی۔ اب وہ پھر اپنی پرانی فلم کمپنی میں کسی اسسٹنٹ کے اسسٹنٹ ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے پاس اس سرمائے میں سے چند سو باقی بچے ہوئے تھے جو انہوں نے اپنی فلم کمپنی کی بنیادوں کے لئے فراہم کیا تھا۔ چڈے کے مشورے پر انہوں نے یہ سب روپیہ جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے دے دیا۔ چڈے نے ان سے کہا تھا'' اب میں چار پیگ پی کر دعا کروں گا کہ وہ تمہاری ذاتی فلم کمپنی فوراً کھڑی کر دے۔''

چڈے کا بیان تھا کہ اس جلسے میں ون کترے نے شراب پی کر خلاف معمول اپنے سالے باپ کی تعریف نہ کی اور نہ اپنی خوبصورت بیوی کا ذکر کیا۔ غریب نواز نے کئی کی فوری

ضروریات کے پیش نظر اس کو دو سو روپے قرض دیئے۔ اور رنجیت کمار سے اس نے کہا "تم ان بیچاری لڑکیوں کو یونہی جھانسے نہ دیا کرو.......... ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت صاف ہو مگر لینے کے معاملے میں ان کی نیت اتنی صاف نہیں ہوتی.......... کچھ نہ کچھ دے دیا کرو!"

میں نے اس جلسے میں رام سنگھ کو بہت پیار کیا اور سب کو مشورہ دیا کہ اسے گھر واپس جانے کے لئے کہا جائے۔ چنانچہ وہیں فیصلہ ہوا اور دوسرے روز غریب نواز نے اس کے ٹکٹ کا بندوبست کر دیا ــــــ شیریں نے سفر کے لئے اس کا کھانا پکا دیا۔ اسٹیشن پر سب اس کو چھوڑنے گئے ٹرین چلی تو وہ دیر تک ہاتھ ہلاتے رہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے اس جلسے کے دس روز بعد معلوم ہوئیں جب مجھے ایک ضروری کام سے پونہ جانا پڑا سعیدہ کاٹیج میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسا پڑاؤ ہے جس کی شکل وصورت ہزار ہا قافلوں۔ کے ٹھہرنے سے بھی تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ کچھ ایسی جگہ تھی جو اپنا خلا خود ہی پُر کر دیتی تھی۔ میں جس روز وہاں پہنچا شیریں کے گھر ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ ون کترے کے ہاتھ میں گلیکسو کا ڈبہ تھا۔ ان دنوں یہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ اس نے اپنے بچے کے لئے کہیں سے دو پیدا کئے تھے، ان میں سے ایک وہ شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کے لئے لے آیا تھا۔ چڈے نے آخری دو لڈو اس کے منہ میں ٹھونسے اور کہا: "تو یہ گلیکسو کا ڈبہ لے آیا ہے ــــــ بڑا کمال کیا ہے تو نے.......... اپنے سالے باپ اور اپنی سالی بیوی کی دیکھنا ہرگز کوئی بات نہ کرنا"۔

ون کترے نے بڑے بھولپن کے ساتھ کہا: "سالے میں اب کوئی پئے لا ہوں...... وہ تو دارو بولا کرتی ہے.......... ویسے بائی گاڈ.......... میری بیوی بڑی ہینڈسم ہے.........."

چڈے نے اس قدر بے تحاشا قہقہہ لگایا کہ ون کترے کو اور کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ اس کے بعد چڈہ غریب نواز اور رنجیت کمار مجھ سے متوجہ ہوئے اور اس کہانی کی باتیں شروع ہو گئیں جو میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے ذریعے وہاں کے ایک پروڈیوسر کے لئے لکھ رہا تھا۔

پھر کچھ دیر شیریں کے نوزائیدہ لڑکے کا نام مقرر ہوتا رہا۔ سینکڑوں نام پیش ہوئے مگر چڈے کو پسند نہ آئے۔ آخر میں نے کہا کہ جائے پیدائش یعنی سعیدہ کاٹیج کی رعایت سے لڑکا مولود مسعود ہے، اس لیے مسعود نام بہتر رہے گا۔ چڈے کو پسند نہیں تھا، لیکن اس نے عارضی طور پر قبول کر لیا۔

اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ چڈہ، غریب نواز اور رنجیت کمار تینوں کی طبیعت

کسی قدر بجھی بجھی سی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہ خزاں کے موسم کی وجہ ہے جب آدمی خواہ مخواہ تھکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ شیریں کا نیا بچہ بھی اس خفیف اضمحلال کا باعث ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ شبہ استدلال پر پورا نہیں اترتا تھا۔ سین کے قتل کے ٹریجڈی .... معلوم نہیں کیا وجہ تھی .... لیکن میں نے یہ قطعی طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ سب افسردہ تھے۔ بظاہر ہنستے تھے بولتے تھے مگر اندرونی طور پر مضطرب تھے۔

میں پربھات نگر میں اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کے گھر میں کہانی لکھتا رہا۔ یہ مصروفیت پورے سات دن جاری رہی۔ مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ اس دوران میں چڈے نے خلل اندازی کیوں نہیں کی۔ ون کترے بھی غائب تھا۔ رنجیت کمار سے میرے کوئی اتنے مراسم نہیں تھے کہ وہ میرے پاس اتنی دور آتا۔ غریب نواز کے متعلق میں نے سوچا کہ شاید حیدرآباد چلا گیا ہو۔ اور میرا پرانا فلموں کا ساتھی اپنے نئے فلم کی ہیروئن سے اس کے گھر میں، اس کے بڑی بڑی مونچھوں والے خاوند کی موجودگی میں عشق لڑانے کا مصمم ارادہ کر رہا تھا۔

میں اپنی کہانی کے ایک بڑے دلچسپ باب کا منظر نامہ تیار کر رہا تھا کہ چڈہ بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا: "اس بکواس کا تم نے کچھ وصول کیا ہے"۔

اس کا اشارہ میری کہانی کی طرف تھا جس کے معاوضے کی دوسری قسط میں نے دو روز ہوئے وصول کی تھی ——— "ہاں .... دوسرا ہزار پرسوں لیا ہے"۔

"کہاں ہے یہ ہزار؟" یہ کہتا چڈہ میرے کوٹ کی طرف بڑھا۔

"میری جیب میں!"

چڈے نے میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو کے چار نوٹ نکالے اور مجھ سے کہا "آج شام کو ممی کے ہاں پہنچ جانا ——— ایک پارٹی ہے۔"

میں اس پارٹی کے متعلق اس سے کچھ دریافت ہی کرنے والا تھا کہ وہ چلا گیا۔ وہ افسردگی جو میں نے چند روز پہلے اس میں محسوس کی تھی، بدستور موجود تھی۔ وہ کچھ مضطرب بھی تھا ——— میں نے اس کے متعلق سوچنا چاہا مگر دماغ مائل نہ ہوا، کہانی کے دلچسپ باب کا منظر نامہ اس میں بری طرح پھنسا تھا۔

اپنے پرانے فلموں کے ساتھی کی بیوی سے اپنی بیوی کی باتیں کر کے شام کو ساڑھے پانچ بجے کے قریب میں وہاں سے روانہ ہو کر سات بجے سعیدہ کاٹیج پہنچا۔ گیراج کے باہر الگنی

پر گیلے گیلے پوتڑے لٹک رہے تھے اور نل کے پاس ایل برادران شیریں کے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ گیراج کے ٹاٹ کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور شیریں ان سے غالباً ممی کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ میں نے چڈے کے متعلق پوچھا تو عقیل نے کہا کہ وہ ممی کے گھر مل جائے گا۔

میں وہاں پہنچا تو ایک شور برپا تھا۔ سب ناچ رہے تھے۔ غریب نواز پولی کے ساتھ، رنجیت کمار کٹی اور ایلما کے ساتھ اور رون کترے تھیلما کے ساتھ۔ وہ اس کو کتھا کلی کے مدرے بتا رہا تھا۔ چڈہ ممی کو گود میں اٹھائے ادھر ادھر کود رہا تھا —— سب نشے میں تھے۔ ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے چڈے نے نعرہ لگایا۔ اس کے بعد دیسی اور نیم بدیسی آوازوں کا ایک گولہ سا پھٹا جس کی گونج دیر تک کانوں میں سرسراتی رہی۔ ممی بڑے تپاک سے ملی —— ایسے تپاک سے جو بے تکلفی کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے کہا: "کس می ڈیئر!"

لیکن اس نے خود ہی میرا ایک گال چوم لیا اور گھسیٹ کر ناچنے والوں کے جھرمٹ میں لے گئی۔ چڈہ ایک دم پکارا "بند کرو —— اب شراب کا دور چلے گا"۔ پھر اس نے نوکر کو آواز دی: "اسکاٹ لینڈ کے شہزادے —— وسکی کی نئی بوتل لاؤ"۔ اسکاٹ لینڈ کا شہزادہ نئی بوتل لے آیا۔ نشے میں دُھت تھا۔ بوتل کھولنے لگا تو ہاتھ سے گری اور چکنا چور ہو گئی۔ ممی نے اس کو ڈانٹنا چاہا تو چڈے نے روک دیا اور کہا: "ایک بوتل ٹوٹی ہے ممی —— جانے دو یہاں دل ٹوٹے ہوئے ہیں"۔

محفل ایک دم سونی ہو گئی۔ لیکن فوراً ہی چڈے نے اس لمحاتی افسردگی کو اپنے قہقہوں سے درہم برہم کر دیا۔ نئی بوتل آئی۔ ہر گلاس میں گرانڈیل پیگ ڈالا گیا۔ چڈے نے بے ربطی تقریر شروع کی: "لیڈیز اینڈ جنٹلمین.................. آپ سب جہنم میں جائیں.................. منٹو ہمارے درمیان موجود ہے۔ بزعم خود بہت بڑا افسانہ نگار بنتا ہے۔ انسانی نفسیات کی —— وہ کیا کہتے ہیں عمیق ترین گہرائیوں میں اتر جاتا ہے.................. مگر میں کہتا ہوں کہ بکواس ہے.................. کنویں میں اترنے والے.................. کنویں میں اترنے والے.................. اس نے ادھر ادھر دیکھا "افسوس کہ یہاں کوئی ہندوستوڑا نہیں۔ ایک حیدر آبادی ہے جو قاف کو خاف کہتا ہے۔ اور جس سے دس برس پیچھے ملاقات ہوئی ہو تو کہے گا پرسوں آپ سے ملا تھا —— لعنت ہو اس کے نظام حیدر آباد پر۔ جس کے پاس کئی لاکھ ٹن سونا ہے۔ کروڑہا جواہرات ہیں، لیکن ایک ممی نہیں.................. ہاں ......

......وہ کنویں میں اترنے والے ....میں نے کیا کہا تھا، کہ سب بکواس ہے ....
پنجابی میں جنہیں ٹوبے کہتے ہیں ....وہ غوطہ لگانے والے، وہ اس کے مقابلے میں انسانی نفسیات کو بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں ....اس لیئے میں کہتا ہوں ....''

سب نے زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ چڈہ چیخا: ''یہ سب سازش ہے ــــــــ اس منٹو کی سازش ہے۔ ورنہ میں نے ہر ہٹلر کی طرح تم لوگوں کو مردہ باد کے نعرے کا اشارہ کیا تھا .... تم سب مردہ باد.........لیکن پہلے میں ....میں ....''وہ جذباتی ہو گیا۔ ''میں ....جس نے اس رات اس ....سانپ کے پیٹ کے کھپروں ایسے رنگ والے بالوں کی ایک لڑکی کے لئے اپنی ممی کو ناراض کر دیا ....میں خود کو خدا معلوم کہاں کا ڈون جوآن سمجھتا تھا ....لیکن نہیں ....اس کو حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے اپنی جوانی کی قسم! ایک ہی بوسے میں اس پلیٹینم بلونڈ کے کنوار پنے کا سارا عرق میں اپنے ان موٹے ہونٹوں سے چوس سکتا تھا ....لیکن یہ ایک ....یہ ایک نامناسب حرکت تھی ....وہ کم عمر تھی ....اتنی کم عمر اتنی کمزور اتنی کیریکٹرس ....اتنی ....''اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا: ''بتاؤ یار اسے اُردو فارسی یا عربی میں کیا کہیں گے .... کیریکٹرس ....لیڈیز اینڈ جنٹلمین ....وہ اتنی چھوٹی اتنی کمزور اور اتنی لاکردار تھی کہ اس رات گناہ میں شریک ہو کر یا تو وہ ساری عمر پچھتاتی رہتی یا اسے قطعاً بھول جاتی ....ان چند گھڑیوں کی لذت کی یاد کے سہارے جینے کا سلیقہ اس کو قطعی طور پر نہ آتا ....مجھے اس کا دکھ ہوتا ــــ اچھا ہوا کہ ممی نے اسی وقت میرا حقہ پانی بند کر دیا ....میں اب اپنی بکواس بند کرتا ہوں۔ میں نے اصل میں ایک بہت لمبی چوڑی تقریر کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا ....میں ایک پیگ اور پیتا ہوں''۔

اس نے ایک پیگ اور پیا۔ تقریر کے دوران میں سب خاموش تھے۔ اس کے بعد بھی خاموش رہے۔ ممی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ غازے اور سرخی کی تہوں کے نیچے اس کی جھریاں بھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ غور و فکر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بولنے کے بعد چڈہ جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔ ادھر ادھر گھوم رہا تھا جیسے کوئی چیز کھونے کے لئے ایسا کونہ ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے --- میں نے اس سے ایک بار پوچھا: ''کیا بات ہے چڈے؟''

اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا: ''کچھ نہیں ....بات یہ ہے کہ آج وسکی میرے دماغ کے چوتڑوں پر جما کے لات نہیں مار رہی''۔

اس کا قہقہہ کھوکھلا تھا۔

ون کترے نے تھیلما کو اٹھا کر مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنے باپ کی تعریف شروع کر دی کہ وہ بڑا گنی آدمی تھا۔ ایسا ہارمونیم بجاتا تھا کہ لوگ دم بخود ہو جاتے تھے۔ پھر اس نے اپنی بیوی کی خوبصورتی کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن ہی میں اس کے باپ نے یہ لڑکی چن کر اس سے بیاہ دی تھی۔ بنگالی میوزک ڈائریکٹر سین کی بات نکلی تو اس نے کہا:

"مسٹر منٹو ——— وہ ایک دم ہلکٹ آدمی تھا ——— کہتا تھا میں خاں صاحب عبدالکریم خاں کا شاگرد ہوں.......... جھوٹ بالکل جھوٹ.......... وہ تو بنگال کے کسی بھڑوے کا شاگرد تھا.........."

گھڑی نے دو بجائے۔ چڈے نے جڑ بگ بند کیا۔ گئی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور بڑھ کر ون کترے کے کدو ایسے سر پر دھپا مار کر بولا: "بکواس بند کر بے ——— اور کچھ گا.......... لیکن خبردار اگر تو نے کوئی پکا راگ گایا"۔

ون کترے نے فوراً گانا شروع کر دیا۔ آواز اچھی نہیں تھی۔ مرکیوں کی نوک پلک واضح طور پر اس کے گلے سے نہیں نکلتی تھی۔ لیکن جو کچھ گاتا تھا، پورے خلوص سے گاتا تھا۔ مالکوس میں اس نے اوپر تلے دو تین فلمی گانے سنائے جن سے فضا بہت اداس ہو گئی۔ ممی اور چڈہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے اور نظریں کسی اور سمت ہٹا لیتے تھے.......... غریب نواز اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چڈے نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا: "حیدر آباد والوں کی آنکھ کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے.......... موقع بے موقع ٹپکنے لگتا ہے"۔

غریب نواز نے اپنے آنسو پونچھے اور ایلما کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔ ون کترے نے گراموفون کے توے پر ریکارڈ رکھ کر سوئی لگا دی گھسی ہوئی ٹیون بجنے لگی۔ چڈے نے ممی کو پھر گود میں اٹھالیا اور کود کود کر شور مچانے لگا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا، ان میراثیوں کی طرح جو شادی بیاہ کے موقعوں پر اونچے سُروں میں گا گا کر اپنی آواز کا ناس مار لیتی ہیں۔

اس اچھل کود اور چیخم دھاڑ میں چار بج گئے۔ ممی ایک دم خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے چڈے سے مخاطب ہو کر کہا: "بس، اب ختم!"

چڈے نے بوتل سے منہ لگایا اسے خالی کر کے ایک طرف پھینک دیا اور مجھ سے کہا: "چلو منٹو چلیں!"

میں نے اٹھ کر ممی سے اجازت لینی چاہی کہ چڈے نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"آج کوئی الوداع نہیں کہے گا۔"

ہم دونوں باہر نکل رہے تھے کہ میں نے ون کترے کے رونے کی آواز سنی۔ میں نے چڈے سے کہا: "ٹھہرو دیکھیں کیا بات ہے" مگر وہ مجھے دھکیل کر آگے لے گیا: "اس سالے کی آنکھوں کا مثانہ بھی خراب ہے"۔

ممی کے گھر سے سعیدہ کاٹیج بالکل نزدیک تھی۔ راستے میں چڈے نے کوئی بات نہ کی۔ سونے سے پہلے میں نے اس سے اس عجیب و غریب پارٹی کے متعلق استفسار کرنا چاہا تو اس نے کہا: "مجھے سخت نیند آ رہی ہے"۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح اٹھ کر میں غسل خانے میں گیا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ غریب نواز گیراج کے ٹاٹ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ آنسو پونچھتا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے پاس جا کر اس سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: "ممی چلی گئی!"

"کہاں؟"

"معلوم نہیں"۔ یہ کہہ کر غریب نواز نے سڑک کا رخ کیا۔

چڈہ بستر پر لیٹا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ میں نے اس سے ممی کے بارے میں پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا: "چلی گئی —— صبح کی گاڑی سے اسے پونہ چھوڑنا تھا۔"

میں نے پوچھا: "مگر کیوں؟"

چڈے کے لہجے میں تلخی آ گئی۔ حکومت کو اس کی ادائیں پسند نہیں تھیں —— اس کی وضع قطع پسند نہیں تھی اس کے گھر کی محفلیں اس کی نظر میں قابل اعتراض تھیں، اس لئے کہ پولیس اس کی شفقت اور محبت بطور یرغمال کے لینا چاہتی تھی۔ .... وہ اسے ماں کہہ کر ایک دلالہ کا کام لینا چاہتے تھے .... ایک عرصے سے اس کا ایک کیس زیر تفتیش تھا۔ آخر حکومت، پولیس کی تحقیقات سے مطمئن ہو گئی اور اس کو تڑی پار کر دیا .... شہر بدر کر دیا .... وہ اگر قحبہ تھی۔ دلالہ تھی —— اس کا وجود سوسائٹی کے لئے مہلک تھا تو اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا —— پونہ کی غلاظت سے یہ کیوں کہا گیا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ، اور جہاں چاہو ڈھیر ہو سکتی ہو۔" چڈے نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر اس نے بڑے جذبات بھرے لہجے میں کہا "مجھے افسوس ہے منٹو کہ اس غلاظت کے ساتھ ایک ایسی پاکیزگی چلی گئی ہے جس نے اس رات میری ایک بڑی غلط اور نجس ترنگ کو میرے دل و دماغ سے دھو ڈالا —— لیکن مجھے افسوس نہیں

ہونا چاہئے — وہ پونہ سے چلی گئی ہے.......... مجھ ایسے جوانوں میں ایسی نجس اور غلط ترنگیں وہاں بھی پیدا ہوں گی جہاں وہ اپنا گھر بنائے گی.......... میں اپنی ممی ان کے سپرد کرتا ہوں — زندہ باد ممی.......... زندہ باد! — چلو غریب نواز کو ڈھونڈیں۔ رو رو کر اس نے اپنی جان ہلکان کر لی ہوگی۔ ان حیدر آبادیوں کی آنکھوں کا مثانہ بہت کمزور ہوتا ہے — وقت بے وقت ٹپکنے لگتا ہے۔"

میں نے دیکھا چڈے کی آنکھوں میں آنسو اس طرح تیر رہے تھے جس طرح مقتولوں کی لاشیں!

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لئے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِّ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹمارہے ہیں۔

ترلوچن کے لئے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اُٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رُواں رُواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔ جب وہ اُوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ــــ محلّے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی

مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔ غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا___ اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آ رہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ۔ مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لئے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔ ”نرنجن یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ تمہارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہاں سے اٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارا کر لیا کرتا ہے۔“ مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرا دیا۔ ”یار تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔ میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبئی ہے بمبئی۔ تمہیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔ بارہ برس سے۔“

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے۔ یا وہ کہانیوں کا کوئی قلعہ ہے۔ جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لئے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کیلئے اچھا تھا۔ وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لئے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں بہت بڑا کھنگر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوئی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار

ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔
کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو جیتے کئے گھنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنہیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔
اسکے نقش پتلے پتلے تھے جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔
ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ۔ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لئے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔
کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پر تھا۔ برما۔ سنگاپور۔ ہانگ کانگ۔ پھر بمبئی جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔
ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بری نہیں تھی۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزار ہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔
کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو ”گوڈے گوڈے“ عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔
جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیلی پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ بانہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون

سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے۔ مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ___ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی، بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں ___ جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب وموزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرادی۔ ''یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے''۔ اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوریڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سنیما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ بانہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت اکھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں ''گوڈے گوڈے'' دھنس جائے گا۔ اور وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سنیما جانے پر تیار ہو جاتی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا

شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پر تکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا، کیونکہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی۔ "تم سکھ ہو۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔"

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا۔ "کون سی نازک باتیں۔ تمہارے پرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی۔ "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ____ ہاں وہ میرے یار ہیں۔ اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔"

ترلوچن بڑے دلیلانہ انداز میں پوچھتا ہے۔ "اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی"

موذیل زور کا قہقہہ لگاتی۔ "تم سچ مچ سکھ ہو ____ ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ۔ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کس سکھنی سے شادی کر لو ____ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"

ترلوچن نرم ہو جاتا ____ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرستان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیا کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی۔ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی

رہ گیا ہے۔ وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔ "موذیل ___ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو"۔

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا۔ "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ___ یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے"۔

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا۔ "تم شیو کرالو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ___ تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے ___ تم خوبصورت ہو"۔

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں ___ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک دم "پُھوں پُھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیٰحدہ ہوگئی۔ "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ___ تم تکلیف نہ کرو"

ترلوچن چلایا۔ "موذیل"۔

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔ جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں۔ "خدا کی قسم ___ تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ___ ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میری نیوی بلو اسکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ___ بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی"۔

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آگئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کردی ___ اس میں جو پنیں لگی تھیں ___ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبا لیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کے کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ یہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس

انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لئے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا۔ مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کردے، جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب ڈاڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی۔ ''تمہارے بال بہت ملائم ہیں ___ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میری نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ___ ترلوچ ___ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انہیں گوندھ کر اپنے لئے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی''۔

اب تو ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔ تم کیوں اڑاتی ہو ___ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ___ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لئے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں۔''

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا۔ ''مجھے معلوم ہے''۔

''پھر''۔ ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہہ کئے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ ''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ___ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں''۔

''مجھے معلوم ہے''۔ بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ ''میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی''۔

ترلوچن اچھل پڑا۔ ''سچ''؟

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لئے چمکے۔ ''ہاں!''

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ تو..... تو کب؟''

موذیل الگ ہٹ گئی۔ ''جب ___ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!''

ترلوچن اس وقت ''جو ہو سو ہو'' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔ ''میں کل ہی کٹوا دوں گا''۔

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ___ تم میں اتنی

ہمت نہیں ہے''۔

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔

''تم دیکھ لوگی''۔

''دیکھ لوں گی''۔ اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور ''پھوں پھوں'' کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ___ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لئے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوادئے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ۔ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر ''مائی ڈارلنگ ترلوچ'' کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی اسکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے اسکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا۔ ''نیچے کچھ پہن تو لیا کرو''۔

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا۔ ''مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ایسے ہی چلتا ہے''

ترلوچن کو پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ ''شادی کل ہو گی!''

''ضرور''۔ موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونہ میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کاروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انہیں پروگرام کے مطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ ترلوچن وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گزری؟ ___ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا ___ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہوگئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے۔ جس نے نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑ کیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگیں کہ وہ انہیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا

تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی۔ ''تم سکھ ہو ___ مجھے تم سے نفرت ہے!''

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دوٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا۔ مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا تو وہ چڑ جاتی تھی۔ ''یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ___ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو ___ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ___ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ___ تم سکھ ہو ___ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلی سا انڈرویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے ___ شرم آنی چاہئے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے!''

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رُک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا۔ کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی جس سے اس کو محبت ہوئی تھی۔ خطرے میں تھی وہ ایسے محلّے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلّے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی

داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا فوٹ میں ایک بار بر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں ___ آواز قریب آتی گئی۔ یکلخت اس نے دوسری ٹنکی کے پاس موذیل کو دیکھا جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ___ اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن پانی کے نل پر سے اٹھا۔ اس نے سوچا۔ ''یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی۔ اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟''۔

موذیل نے ایک اور انگڑائی لی ___ اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ___ ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاؤں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منھی داڑھی دیکھنے لگی۔ ''تم پھر سکھ بن گئے ترلوچ؟''

داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا۔ ''اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو اسکرٹ صاف کر سکے۔ مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے''۔

ترلوچن خاموش رہا۔

موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔ ''بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟''

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس سے پوچھا۔ بیمار رہی ہو؟''

''نہیں''۔ موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

''کمزور دکھائی دیتی ہو؟''

''میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں''۔ موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے

ساتھ بجانے لگی "تم گویا کہ ___ اب پھر ___ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو"۔

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ "ہاں!"

"مبارک ہو۔" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں!"

"مبارک ہو۔ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"۔

"یہ بہت بری بات ہے"۔ موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔

"ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔

"کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔ وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکرے کر دیئے ہیں۔

مسکرانے کے بعد وہ ہنسی۔ "تم اب یہ داڑھی منڈوا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو میں تم سے شادی کر لوں گی"۔

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا۔ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے۔ بے وفا ہے۔ بے مرّوت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا۔ "موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ___ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے

میں گھوم کر ترلوچن سے کہا۔ ”وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟“

”اس کو ابھی تک معلوم نہیں ____ داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی۔ محض انتقامی طور پر ____ اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے“۔ ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجانی شروع کی۔ ”یہ بہت اچھا ہے ____ مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے ____ دیکھو، کس زور سے کاٹا ہے“۔

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ”کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟“

”ابھی کچھ پتہ نہیں“۔ یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا۔ ”ترلوچ۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی۔ ”تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟“

”مشکل! ____ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ____ کسی بھی معاملے کی نزاکت ____ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو ____ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا“۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔ ”افسوس بی ڈیمڈ سلی ایڈیٹ ____ تم یہ سوچو کہ تمہاری اس ____ کیا نام ہے اس کا ____ اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ____ تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ____ تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو۔ اور بہت ڈرپوک ____ مجھے نڈر مرد چاہئے ____ لیکن چھوڑ دو ان باتوں کو ____ چلو آؤ تمہاری اس کور کو لے آئیں!“

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا۔ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا۔ ”کہاں سے؟“

''وہیں سے جہاں وہ ہے۔ میں اس محلّے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔ چلو آؤ میرے ساتھ''۔

''مگر سنو تو ___ کرفیو ہے''۔

''موذیل کے لئے نہیں ___ چلو آؤ''۔

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی جو نیچے سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

موذیل نے کہا۔ ''یہ تمہاری داڑھی۔ لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے۔ ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ سکھ ہو''۔

''ننگے سر!'' ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ ''میں ننگے سر نہیں جاؤں گا''۔

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا۔ ''کیوں؟''

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ ''تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں''۔

''کیوں ٹھیک نہیں''۔

''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا ___ وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا''۔

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری۔ ''تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو۔ گدھے کہیں کے ___ اس کی جان کا سوال ہے۔ کیا نام ہے، تمہاری اس کور کا جس سے تم محبت کرتے ہو''۔

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔ اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی''۔

موذیل چڑ گئی۔ ''اوہ تمہاری محبت بی ڈیمڈ ___ میں پوچھتی ہوں۔ کیا سارے سکھ تمہاری طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اسکی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔ اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے''۔

ترلوچن نے کہا۔ ''وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں''۔

بہت اچھا کرتے ہو۔ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلّے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں

بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کردئے جاؤ گے"۔

ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا۔ "مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے۔ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ___ تمہاری وہ ___ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ___ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان نہ رہے گا ___ تم سکھ ہو ___ خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچ بھنا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ ڈارلنگ، چلو، جیسے تمہاری مرضی ___ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی!"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "نہیں۔ چلے گا اسی طرح"۔

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگریٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا۔ "تم بہت ذلیل ہو"۔

موذیل مسکرائی۔ "یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس

وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔"

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتا بھی کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ "اے ___ کدھر جا رہا ہے"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ "اوہ، تم ___ ہم کو پہچانا نہیں تم نے ___ موذیل ...." پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ "اِدھر اِس باجو .... ہماری بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر لے کر جا رہا ہے..."

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر اس کو دیا۔ "لو پیو"۔

سپاہی نے سگریٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگریٹ نکالا اور اس سے کہا۔ "ہیر از لائٹ!"

سپاہی نے سگریٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔ جس میں سے گزر کر انہیں محلّے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مسرت محسوس کر رہی ہے۔ خطرہ سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی

کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے ڈر ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رُک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا۔ ترلوچ ڈیئر۔ اس طرح ڈرنا اچھا نہیں ___ تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ سچ کہتی ہوں یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طئے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلّے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رُک گئی۔ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ"۔

دونوں چلنے لگے ___ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا کہ موذیل آ گئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔ "اے کیا کرتا ہے۔ اپنے بھائی کو مارتا ہے۔ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے"۔ پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ "کریم۔ اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر"۔

اس آدمی نے نیفے سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا۔ "عیش کر سالی عیش کر"۔ پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔ "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ "کوئی ذلیل حرکت نہیں ___ سب چلتا ہے آؤ"۔

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ___ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دئے۔

یہ گلی طئے کر کے دونوں اس محلّے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا۔ "کس گلی میں جانا ہے؟"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "تیسری گلی میں ___ نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان

آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑ بڑ دکھائی دی۔ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ "موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا۔" ترلوچ ڈیئر۔ یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا۔ "میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اُتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ "تمہاری مرضی۔ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ___ صاف گڑ بڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا۔" دیکھو ایسا کرو ___ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ___ تم میرے پیچھے آنا ___ بڑی تیزی سے جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ___ سمجھے ___ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو"۔

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھی ___ سٹیرھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا۔ "کون مالا؟"

ترلوچن نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "دوسرا"۔

"چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہولیا زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دُور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پہ دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی "مہنگا سنگھ

جی ___ مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی۔ "کون!"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ___ جو بے حد سہی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لئے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سُرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا۔ "ڈرو نہیں ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے"۔

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف سہی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں ___ اور اپنی ماتا جی سے بھی ___ لیکن جلدی کرو"۔

اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی۔ "اسے پکڑ لیا انہوں نے!"

ترلوچن نے پوچھا۔ "کسے!"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی۔ "پکڑ لیا تو اچھا ہوا ___ تم یہ کپڑے اُتارو"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیض اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانہوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کُرتا اُتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اُتار کر ترلوچن سے کہنے لگی۔ "جاؤ، اسے لے جاؤ ___ لیکن ٹھہرو"۔

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دئے اور اس سے کہا۔ "جاؤ ___ جلدی نکل جاؤ"۔

ترلوچن نے اس سے کہا۔ "آؤ"۔ مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑاپن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں"

"جہنم میں جائیں وہ ___ تم اسے لے جاؤ"۔

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی"۔

ایک دم اُوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اُترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر انہوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔

"سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں ___"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ "دروازہ"۔

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔ "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں۔ تم میرے پیچھے بھاگنا ___ میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔ تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ لوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے ___"

ترلوچن نے پھر پوچھا۔ "پھر؟"۔

موذیل نے کہا۔ "یہ تمہاری ___ کیا نام ہے اس کا ___ موقعہ پا کر نکل جائے ___ اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا"۔

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔ سب بوکھلا گئے اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔ وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا ___ اُوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے

جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آ رہی ___ پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اُترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گئے ___ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی۔ ''موذیل ___ موذیل''۔

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اُتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ ___ میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں ___ میرا مطلب ہے وہ ___''

ترلوچن اس کا مطلب ''سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصّے میں کہا۔ ''تم سچ مچ سکھ ہو ___ جاؤ دیکھ کر آؤ''۔

ترلوچن اُٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ میاں بھائی ہے ___ لیکن بہت دادا قسم کا ___ میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں''۔

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا۔ ''اوڈیم اِٹ ___ '' یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔ ''آل رائٹ ڈارلنگ ___ بائی بائی''۔

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی۔ ''لے جاؤ اس کو ___ اپنے اس مذہب کو''۔ اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔ وہ روپے جو اس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔ اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی۔ جس کا اَدّھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس ''بیوڑا'' کا نتیجہ تھی۔ جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں، جو کاندھے تک ننگی تھی، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں، جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا۔ جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔

تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور وہ نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے۔ دور سے اگر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرح چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی ہونٹوں کی سرخ بتی، پاؤڈر کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ اپنے جوڑے میں غالباً لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔ پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹر وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے، جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر، جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا۔ تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوج کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دور سے گنیش جی کی مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی، اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لے کر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے

سے آکر سوگندھی پر دھاوے بولتا ہے تو کہا تھا...... ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے؟......
یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے!۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے...... سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو ممبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا...... ''سالی اپنا دھن یوں نہ برباد کر...... تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار کر لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ آیا کرے تو اس سے کہا کر...... تیری جان کی قسم مادھو، آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ نیچے والے سے کہہ کر ایک کپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ سمجھیں؟۔ بہت نازک وقت آ گیا ہے۔ میری جان...... اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے۔ تیری جون میں چلاؤں۔''

(سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا نیچے سے ان سیب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر، انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی ٹھیک رہے گی۔'')

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔ ''جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا......
کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ...... ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا...... جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی...... ارے وہ تو ڈرنے لگا...... سنتی؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کر کرا ہو گیا!...... وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ جائے گا...... بولا...... روشنی کرو روشنی کرو...... میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہوا...... بولا لائٹ......
لائٹ...... اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ ''بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی!''......
اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی...... تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔

میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا۔ تجھے شرم نہیں آتی مردود ے۔" وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھادی!...... وہ پھر گھبرانے لگا...... تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی، کبھی اندھیرا، کبھی اُجالا، کبھی اُجالا، کبھی اندھیرا...... ٹرام کی کھڑ کھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا...... سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے جو یوں مفت دے گیا...... جمنا، تو بالکل الھڑ ہے، بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لئے!""

سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی...... "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اس سے خوب شرارتیں کرو، ان گنت باتیں کرو، اسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اس سے کھیلو...... اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ...... اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے...... خوش خوش چلا جائے گا اور تم بھی بچی رہو گی...... ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہیں بڑے خطرناک ہوتے ہیں ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے!"""

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی، جتنی کہ خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اسے یاد تھے۔ اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آجاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑگئی تھیں!...... ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنادیئے ہیں...... جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کتے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی، لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات...... کوئی کومل بول...... اس کے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصّوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے...... ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر...... انہیں مار کر سلانے پر مجبور کردے یا ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے...... وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہوجانے پر طاری ہوتی ہے، آنند دیتی ہے!...... کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ اور اس کے ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔

اوپر ہوا، نیچے ہوا، دائیں ہوا، بائیں ہوا، بس ہوا ہی ہوا! اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزہ دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزہ دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے صندوق میں چھپ کر گزارے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی!...... کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا...... بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لئے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لئے بے شمار گُر یاد تھے، اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ ''سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔'' اور سوگندھی یہ جان بوجھ کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے، بس موم ہو جاتی تھی۔ اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے...... پریم...... کتنا سندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے، اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے...... یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اسے اپنی گود میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی، جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا۔ یہ بات اس

کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا......
"سوگندھی......تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں، اس کے جیون کے ہر تار سے وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی، تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتتے چلے جائیں، اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی، دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات روپے سے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لئے آتا تھا، تو وہ دس پندرہ روپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں ایسی بات ضرور تھی، جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں!......سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ "تجھے لاج نہیں آتی۔ اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟......اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟......چھی چھی چھی......دس روپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلال کے باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟......اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا......مجھے عورت چاہئے پر تجھے کیا اس وقت، اسی گھڑی مرد چاہئے؟......مجھے تو کوئی عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہوں!۔ تیرا میرا ناتا ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں......بس یہ دس روپے، جن میں سے ڈھائی دلالی کے چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی، تیرا من کچھ اور سوچتا ہے، میرا من کچھ اور......کیونکہ نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری......پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے......یہ دھندا چھوڑ......میں تجھے خرچ دے دیا کروں گا......کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لئے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی

تھیں، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا...... ''سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا...... اور پانی کا یہ گھڑا...... دیکھنا کتنا میلا ہے اور یہ...... یہ چیتھڑے...... یہ چندیاں...... اف کتنی بری باس آتی ہے، اٹھا کر باہر پھینک ان کو...... اور تو نے اپنے بالوں کا ستیا ناس کر رکھا ہے...... اور...... اور...... تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا۔ اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا، دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے...... ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہوں۔'' مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھی اس نے سوگندھی کو...... اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

''مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا۔'' دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونہ پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......''

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا۔ تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟'' اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا۔ ''یہ مال تیرے پاس کہاں سے آتا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔''...... دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی زندگی بسر کر رہے تھے...... لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہوئے گہنوں ہی پر راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندھی سو رہی تھی بجلی کا قمقمہ جسے اوٹ کرنا وہ بھول گئی تھی۔ اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی، مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی...... رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود

کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی...... دو ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیس دار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑھا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر پر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹاغٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ ''رام لا؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا۔ ''تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟''...... پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا۔ ''اندر کوئی ہے تو نہیں؟''

جب سوگندھی نے کہا۔ ''نہیں''۔...... تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ ''تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟...... بھئی حد ہو گئی ہے۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک چھوکری اُتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا...... اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے۔ جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں...... چل چل ایک دم جلدی کر۔''

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ ''رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔''

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔ تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔''

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔ ''یہ بات نہیں رام لال۔''...... ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں...... بہت پی گئی۔''

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ''تھوڑی بچی ہو تو لا...... ذرا ہم بھی منہ کا مزہ ٹھیک کر لیں۔''

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔ ''بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا...... دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آؤ۔''

رام لال نے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے جنٹلمین آدمی ہیں۔ وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے...... تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ کبھی قبول نہ کرتی تھی، مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ ''بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔'' مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیلی کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں اور بازار سے بھی کچھ بڑی تھی۔ بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے۔ پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آنا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی...... سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ ''لیجئے وہ آ گئی...... بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے۔'' پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''سوگندھی، ادھر آ، سیٹھ جی بلاتے ہیں۔''

سوگندھی ساڑی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی سیٹھ جی نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لئے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ!'' نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا......

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا۔ اس ''اونہہ'' کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟...... کیا؟''

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ ''پسند نہیں کیا تجھے؟...... اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کیے۔''

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں، اس کی بانہوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت کا ارادہ پیدا ہوا۔ کہاں تھی وہ موٹر...... کہاں تھا وہ سیٹھ...... تو ''اونہہ'' کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا...... اس کی......

گالی اس کے پیٹ کے اندر اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دُم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال انگارہ ''اونہہ'' ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔ ''ارے سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی بس ایک منٹ کے لئے۔'' پر وہ سیٹھ لعنت ہے اس کی ذات پر، بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑی جو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔ یہ ساڑی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑی کے چیتھڑے اڑا دے، کیونکہ ساڑی ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ اونہہ'' کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آگیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا۔ ''میں نے اس موئے کو دکھانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت ہے۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے...... پر...... پر...... یہ رات

کے دو بجے اور رام لال دلال اور...... یہ بازار...... اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک" ...... یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور ان کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کی ٹانگوں میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اس کی بانہوں میں درد ہو، ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔ کیا یہ درد تھا؟ ایک لمحے کے لئے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔ یہ کیا تھا؟...... لعنت! یہ وہی "اونہہ" تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ تجھے پسند نہیں کیا! اسے...... اسے...... صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی...... نہیں آئی کیا ہوا؟...... مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آتی...... وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا، کتنی بری صورت تھی اس کی، کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟ ٹھیک ہے، پر سوگندھی...... تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔ اونہہ۔ اس "اونہہ" کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔ اونہہ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔ دس روپے اور یہ عورت...... خچر کیا بری ہے......"

سوگندھی سوچ رہی تھی اور کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی۔ اس خیال کے

آتے ہی اس کی آنکھیں اس کے کان، اس کی بانہیں، اس کی ٹانگیں، اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے، ایک بار پھر ہو۔ صرف ایک بار...... وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ "اونہہ" کی آواز آئے اور وہ...... سوگندھی...... اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور...... اور اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے۔ اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے...... جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لئے آیا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن رہے تھے، ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ "تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟"...... آنکھوں نے کیا ہوا سوال چند لحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا۔ جواب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلاء کو گھورتی رہی، جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ...... یہ آواز کہاں سے آئی؟ سوگندھی نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کسی کو نہ پایا۔ ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔ اس کا دل اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا۔ بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رک جاتا تھا۔ "رات کٹی گن گن تارے"۔ کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسماں تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کتنے سندر ہیں۔" وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دل میں کودا۔ "تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے...... کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ روپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی

شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔ بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی، پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا رہا کرتی تھی ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا، اب اس کے پاس واپس جانے کے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس کر دیئے تھے۔ ''مجھ میں کیا برائی ہے؟''۔ سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری، ان سب چیزوں کی طرف اس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے، پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ کوئی...... کوئی...... اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ ''سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بری ہے، جو تجھے برا کہے، وہ آپ برا ہے''...... نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ ''سوگندھی تو بہت اچھی ہے!''

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ''ماں'' بن رہا تھا۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شئے کو اپنی گود میں لینے کے لئے تیار ہو رہی تھی؟ اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔ اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شئے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی، ہمدردی کی

نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے۔ لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟...... وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے...... اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے۔ ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو...... کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بھبکے کے پاس کھڑی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بھبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اسے کچھ نظر نہ آیا...... اسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور...... اور......

''نہ آئے...... بلا سے...... میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں...... گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کا دردِ سر ہی تو ہے...... چل سوگندھی گھر چل، ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا...... فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا...... سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی''......

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر، باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں......

اس سیٹھ نے...... پرماتما کرے...... سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا، بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی...... اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا...... کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی یہی لینے آیا تھا نا تو؟...... لے دام دیئے بنا لے جا اسے...... پر جو کچھ میں

ہوں جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا۔"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے، اگر اس سیٹھ سے ایک بار صرف ایک بار۔ اس کی مڈ بھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں، یہ نہیں، یہ کرے...... یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں یوں...... لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی...... بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی! کنڈے میں تالا نہیں تھا!۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی نے کنڈی کھولی دروازے نے جمائی لی۔ سوگندھی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔ آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔ صبح کی سیر تندرستی کے لئے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز اس طرح صبح اٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کرتی ہے...... وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟...... کیوں؟'

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس لئے وہ کچھ کہہ دیا کرتا تھا۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔ "میں آج تیرا انتظار ہی کر رہی تھی۔"

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔ "انتظار؟...... تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔"

سوگندھی کے بھنچے ہوئے لب کھلے۔ ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔ اٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سو، جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں...... اور......"

مادھو خوش ہو کر بولا۔ "اور میں آ گیا...... بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ، دل کو دل سے راہ ہے...... تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا۔ "چار بجے کے قریب"

مادھو کرسی پر سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔ جیسے تو پھولوں کی ساڑی...... ارے بالکل یہی ساڑی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں کیا تھا۔ تیرے ہاتھوں میں!...... ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔ تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔

"مادھو، تو چنتا کیوں کرتا ہے؟"۔ لے یہ تھیلی...... ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟"...... سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا...... کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!...... بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔ اب بیس روپے ہوں تو انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے...... تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے...... ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں بانہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور اس لہجے میں جو اس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی۔ "مادھو، یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟...... جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے...... بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے...... جان بچی لاکھوں پائے...... بس بس اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے...... مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا...... کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے...... واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا...... اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں، میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس"! یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شئے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی"۔ ہمارا فوٹو اترے گا۔ ہمارا فوٹو اترے گا!"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی...... اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔ ''کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی ہے؟''

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغۂ صفائی کی تھی۔ ''اس کی...... منشی پالٹی کے اس داروغہ کی...... ذرا دیکھ تو اس کا تھوبڑا...... کہتا تھا۔ ایک رانی مجھ پر عاشق ہوگئی تھی...... اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔'' یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا۔ ''رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی۔''

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا پھر ہنسا۔ ''ہی ہی ہی......''

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ ''اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے!۔ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا...... کیوں مادھو؟''

مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور ہنسا۔ ''ہی ہی ہی......''

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ''اونہہ'' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔ ''اچھا کیا؟...... مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔''

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا...... پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کون سی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے...... یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان یہ تیرے منہ کی

باس، یہ تیرے بدن کا میل؟...... تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپائے ہوئے تھے اس نے......

......آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا۔"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ دیکھو سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے...... اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں......"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا...... اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا...... ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟" مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ "میں بتاتی ہوں...... پندرہ روپیہ بھاڑا ہے۔ اس کھولی کا اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا...... اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے ہوتے ہیں، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا، جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا...... تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری...... پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔ یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا "سوگندھی!"

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔ "یہ چیتھڑے، یہ چندیاں...... اُف کتنی بری باس آتی ہے، اُٹھا کر باہر پھینک ان کو......"

مادھو چلایا۔ "سوگندھی!"

سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔ "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے، یہاں؟۔ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا بڑا گھبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں...... کتے کمینے، مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہوں

کیا؟...... بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟...... میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟...... چور یا گٹھ کترا؟...... اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟...... بلاؤں پولیس کو؟ پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کردوں۔"

مادھو سہم گیا۔ دبے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔ "سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے۔"

"تیری ماں کا سر...... تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ بھاگ یہاں سے، ورنہ......"

سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھی چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کردیا۔ کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔ مادھو ڈر گیا۔ گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لئے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی "خبردار...... پڑے رہنے دے وہیں۔ تو جا، تیرے پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کردوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی ٹنڈ منڈ دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے...... جیسے مسافروں سے لدی ہوئی گاڑی سب اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے...... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلاء کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پُر کرتی تھی۔ اُدھر خالی ہو جاتا تھا۔ بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اسے اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی!

اے رحمان (جن کو اب بجا طور پر مجلدِ اردو کہا جانے لگا ہے) ایک کثیر الجہات شخصیت کا نام ہے۔ قانون داں، مہم جو، صحافی، ادیب، فلم ساز اور سب سے بڑھ کر انتہائی بدلہ سنج، نکتہ شناس اور جانِ محفل .... رحمان صاحب نے بے شمار میدان ہائے کارزار میں شہسواری کی ہے۔ گرے بھی ہیں، مجروح بھی ہوئے ہیں لیکن پھر اٹھ کر کسی نئے قلعہ کی فتح کے لیے چل پڑے ہیں۔ وکالت سے وابستہ کسی شخص کا ادب اور فنونِ لطیفہ سے علاقہ رکھنا ذرا مشکل ہی تصور ہوتا ہے مگر رحمان صاحب کے حلقہ احباب میں اونچی سطح کے ادیب، شاعر اور فنکار ہیں اور سب ان کے اعلیٰ ادبی ذوق اور وسعت مطالعہ کے معترف ہیں۔

صرف قریبی احباب ہی اس بات سے واقف ہیں کہ موصوف اردو، ہندی، انگریزی، پنجابی، عربی اور فارسی کے علاوہ جرمنی، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں۔ خاص دہلی والے ہیں اور دہلی کی تاریخ اور کلچر سے گہری دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ کرخنداری زبان پر عبور ہے۔ انگریزی ادبیات میں ایم اے کرنے کے بعد قانون کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے صحافت میں ڈپلوما کیا اور پچھلی دہائی میں تین سال تک ایک انگریزی ہفتہ وار Look In کی ادارت کر چکے ہیں۔

ان کے والد مرحوم (اے۔ مجید) خود افسانہ نگار تھے اور نئی لکیر کے عنوان سے ایک ادبی رسالہ نکالتے تھے۔ گھر کے ادبی ماحول اور کتابوں تک دسترس نے اوائلِ عمر میں ہی منٹو سے روشناس کرادیا۔ بتاتے ہیں کہ چودہ سال کی عمر میں پورا منٹو پڑھ ڈالا تھا۔ کالج پہنچ کر پہلے ہیولاک ایلس اور پھر فرائڈ کے باقاعدہ مطالعے نے وہ بصیرت عطا کی جس نے ان کو نئے سرے سے منٹو کا گرویدہ کر دیا۔ پچھلے تین سال سے ہیولاک ایلس اور فرائڈ کے مطالعہ کی روشنی میں منٹو کے فن کا تجزیہ کر رہے تھے جس کا ایک نتیجہ اس کتاب کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

— پروفیسر صادق

M. R. Publications
Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com